۱۸۵۷ء
(روزنامچے، معاصر تحریریں، یادداشتیں)
مرتبہ: محمد اکرام چغتائی

(روزنامچے، معاصر تحریریں، یادداشتیں)

مرتبہ

محمد اکرام چغتائی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

954.912 Chaghatai, M. Ikram
1857: Roznamchay, Muaasir Tehrerain, Yaddashtain/ ed. by M. Ikram Chaghatai.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2007.
928pp.
1. History - Indian Mutiny (1857).
I. Title.

2007
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1968-X

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

مولانا فضل حق خیر آبادی

فتویٰ جہاد ۱۸۵۷ء

دہلی میں جنگ آزادی کا آغاز تو ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ہو گیا تھا، لیکن اس تحریک میں جوش و خروش اس وقت پیدا ہوا جب ۲ جولائی کو جنرل بخت خاں دہلی پہنچے۔ انہوں نے دہلی پہنچتے ہی ایک کام تو یہ کیا کہ مجاہدین کے انتشار کو دور کیا اور ان میں نظم و ضبط پیدا کیا اور دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ علمائے دہلی اور دیگر مقامات کے علماء جو اس وقت دہلی میں موجود تھے، انہیں جمع کیا اور صورتحال کی وضاحت کے بعد ان کے سامنے ایک استفتا پیش کیا اور درخواست کی کہ وہ موجودہ حالات میں جہاد کی فرضیت یا عدم فرضیت کے بارے میں حکم شرعی سے مسلمانوں کی رہنمائی فرمائیں۔ چنانچہ علما نے جہاد کی فرضیت کے باب میں فتویٰ دیا۔ یہ فتویٰ اسی زمانے میں ''ظفر الاخبار'' اور ''صادق الاخبار'' میں شائع ہوا اور اس کی اشاعت سے نہ صرف مسلمانوں کا انتشار ذہنی ختم ہوا بلکہ مجاہدین اور تحریک آزادی کو ملک کے عوام خصوصاً مسلمانوں کی کامل پشت پناہی اور تعاون حاصل ہو گیا۔

لیکن ایک زمانے تک فتوے کی عدم دستیابی کی وجہ سے، اس کے مفتیان کرام کے بارے میں کئی غلط فہمیاں کارفرما رہیں۔ اکابر علمائے وقت میں سے حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی کے بارے میں کہا گیا کہ وہ نہ صرف اس پر دستخط کرنے اور تائید کرنے والے ایک مفتی ہیں بلکہ فتوے کے اصل محرک وہی ہیں۔ حضرت مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کے بارے میں روایت تھی کہ فتوے پر ان کے دستخط نہیں ہیں۔ مولوی محمد محبوب علی کے بارے میں مشہور ہوا کہ انہوں نے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا اور حضرت مفتی صدر الدین آزردہ کے بارے میں تحریر ہوا کہ انہوں نے فتوے پر اپنے دستخط کے ساتھ ''کتب بالخیر'' لکھا تھا لیکن 'خ' کا نقطہ چھوڑ دیا تھا۔ سقوط دہلی کے بعد جب انگریزوں نے ان کی گرفت کی تو انہوں نے کہہ دیا کہ دستخط مجھ سے بالجبر کرائے گئے تھے چنانچہ میں نے دستخط کے ساتھ ''کتبت بالجبر'' لکھ دیا تھا۔ دیکھا گیا تو واقعی ایسا تھا اور اس طرح انہوں نے اپنی گلو خلاصی کرائی، لیکن اب فتویٰ دستیاب ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ سب افسانے ہیں۔ مولانا فضل حق اس کے محرک نہیں ہو سکتے اس لیے کہ وہ دہلی پہنچے ہی وسط اگست میں تھے، جب کہ فتویٰ مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا۔ حضرت محدث دہلوی، مولوی سید محبوب علی دونوں کے دستخط اس پر موجود ہیں اور حضرت مفتی صاحب کے نام کے ساتھ ''کتبت بالجبر'' یا اس قسم کا کوئی

جملہ موجود نہیں ہے۔

یہ فتویٰ سب سے پہلے ''اخبار الظفر'' دہلی میں شائع ہوا تھا۔ اس سے ''صادق الاخبار'' دہلی نے ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں نقل کیا۔ ''صادق الاخبار'' سے یہ فتویٰ محمد عتیق صدیقی، مولانا سید محمد میاں، خورشید مصطفیٰ رضوی، عبدالرزاق قریشی، امداد صابری اور ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی تالیفات اور دیگر متعدد کتب اور بے شمار رسائل میں نقل کیا جاچکا ہے۔ بعض نے اس کا عکس شائع کیا ہے۔ ہمارے سامنے مولانا سید محمد میاں کی تالیف ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' اور ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی بے مثال تحقیق ''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات وشخصیات)'' ہے۔ لیکن یہاں ''دستخط ومواہیر'' کو محمد عتیق صدیقی کی تالیف ''۱۸۵۷ء کے اخبارات و دستاویزات'' سے ''صادق الاخبار'' کے عکس کے مطابق پیش کیا جارہا ہے۔

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلّی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں اور اگر وہ فرض ہے تو فرض عین ہے یا نہیں۔ اور لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے ہیں ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں۔ بیان کرو اللہ تم کو جزا دے۔

جواب

درصورت مرقومہ فرض عین ہے اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے، چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے۔ بہ سبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجودہ ہونے والے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف وحوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں۔ باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلہ سے یا سستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض عین ہو جائے گا۔ اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہوگا۔ اور جو عدو اور بستیوں پر ہجوم اور قتل اور غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہو جائے گا۔ بشرط ان کی طاقت کے۔

دستخط اور مواہیر

المجیب المصیب احقر العباد نور جمال عفی عنہ۔ العبد محمد عبدالکریم، العبد فقیر سکندر علی،

سید محمد نذیر حسین، رحمت اللہ مفتی، محمد صدر الدین، مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی، محمد ضیا الدین،

صح ہذا الجواب عبدالقادر۔ فقیر احمد سعید احمدی، العبد محمد میر خان، محمد مصطفیٰ خاں ولد حیدر شاہ نقشبندی

محمد کریم اللہ، العبد مولوی عبد الغنی، خادم العلما محمد علی، فرید الدین،

محمد سرفراز علی، سید محبوب علی جعفری، حاجی الدین، محمد ابو احمد، العبد سید احمد علی، الٰہی بخش،

محمد انصار علی، مولوی سعد الدین، نام پڑھا نہیں جاتا، سراج العلماء ضیاء الفقہا مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی خان،

حیدر علی، حفیظ اللہ خاں، محمد نور الحق چشتی، واللہ الغنی واشم الفقرا،

العبد سیف الرحمٰن،

سید عبد الحمید عفا اللہ عنہ، محمد ہاشم، سید محمد، محمد امداد علی عفی عنہ، خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القصنات محمد علی حسین

☆......☆......☆

امتیاز علی خاں عرشی رامپوری

مولانا فضل حق خیر آبادی

اور

۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جن اہل علم نے سزا بھگتی، اُن میں مولانا فضل حق خیر آبادی بھی شامل ہیں۔ مولانا عبدالشاہد خان شروانی نے ''باغی ہندوستان'' میں لکھا ہے[1]

علامہ فضل حق کو بھی باغی قرار دیا گیا۔ اسیر فرنگ ہو کر بند ہوئے۔ ۱۲۷۵ھ کے مطابق ۱۲۵۹ء میں لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔ علامہ کے ثبات، استقلال، صداقت، حقانیت اور بلند ہمتی و شیر دلی کے لیے سیر العلما کی یہ عبارت کافی ہے۔ ۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مولانا موصوف کے فیصلے کے لیے جیوری بیٹھی۔ ایک اسیر نے واقعات سُن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل مولانا خود بحث کرتے تھے، بلکہ لُطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کیے اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی ادلہ سے توڑ دیے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصے کام بھی سیکھا تھا۔ وہ مولانا کی عظمت و تبحر سے بھی واقف تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔ کرے تو کیا کرے۔ ظاہر یہ تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے...... دوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لیے تھے۔ ایک ایک کر کے سب رَد کر دیئے۔ جس مخبر نے فتوے کی خبر کی تھی، اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کی فرمایا۔

> ''پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا تھا اور آج اس وقت بھی میری رائے وہی ہے۔''

جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ مخبر نے عدالت کا رُخ اور علامہ کی بارعب و پُر وقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں، وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسن صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا۔ مگر علامہ کی شان استقلال کے قربان جایئے۔ خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے کہ وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

علامہ کے اقرار و توثیق کے بعد گنجائش ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔ بے حد رنج کے ساتھ عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا۔ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سنا۔

”علامہ کے استاد بھائی اور رفیقِ خاص مفتی صدر الدین صاحب آزردہ صدر الصدور دہلی نے بھی علامہ کی خاطر سے فتویٰ پر ”شہدت بالجر“ لکھ کر دستخط کر دیئے تھے۔ گرفتاری کے بعد مفتی صاحب نے بتایا کہ میں نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ جبراً دستخط کرنا پڑ رہے ہیں۔ بالجر پر نقطے نہ لگائے تھے۔ علمائے وقت نے اسے بالخیر پڑھا اور مفتی صاحب نے باجبر بتا کر جان چھڑائی، البتہ جائیداد و املاک کا کافی حصہ ضبط کر لیا گیا۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

بلند ہمتی کی سعادت ہر شخص کے حصے میں نہیں آیا کرتی۔

نہ ہر درخت تحمل کند جفای، خزاں
غلامِ ہمت سردم کہ ایں قدم دارد،

مولانا شروانی کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ مولانا خیر آبادی پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے جہاد کا فتویٰ لکھ کر مسلمانوں کو انگریزی حکومت کے خلاف اور سلطنت مغلیہ کے ساتھ وفاداری پر آمادہ کیا۔

۲۔ مولانا پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور انہیں صفائی پیش کرنے کا پورا موقع ملا تھا۔

۳۔ مولانا نے اپنی صفائی پیش بھی کی تھی اور خود بحث کر کے اپنی برأت ثابت بھی کر دی تھی۔

۴۔ ایک اسیر بھی مولانا کی رہائی کا مؤید تھا۔

۵۔ جج بھی، جو مولانا کا شاگرد تھا، از راہ ہمدردی مولانا کو چھوڑ دینا ہی چاہتا تھا۔

۶۔ گواہ نے بھی کہہ دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں ہیں۔ وہ دوسرے تھے۔

۷۔ مگر دوسرے دن مولانا نے شانِ استقلال اور بلند ہمتی دکھائی اور اپنے فتوے جہاد لکھنے کے جرم کا اقرار کر لیا اور باوجودیکہ

۸۔ جج نے مولانا کو بار بار روکا، مگر وہ اپنی بلند ہمتی کے باعث اپنے اقرار پر جمے رہے۔

۹۔ مجبوراً جج نے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم دے دیا۔

جہاں تک واقعات تاریخی کا تعلق ہے۔ ان شقوں میں سے اکثر محتاج ثبوت ہیں بلکہ مولانا کے رسالہ غدریہ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا کا بیان ان کے خلاف ہے۔

(ا) سب سے پہلے فتویٰ جہاد کو لیجئے، جو مولانا کے سزایاب ہونے کی بنیاد ہے۔ مولانا شروانی نے اسی کتاب کے صفحہ ۱۵۶ پر لکھا ہے۔

> ''علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورے کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علماء کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کر دیے۔ اس فتوے کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئے تھے''

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جنرل بخت خاں کے مشورے کے بعد مولانا خیر آبادی نے جامع مسجد میں تقریر کر کے علماء کو جہاد کا فتویٰ دینے پر آمادہ کیا۔

کیونکہ مولانا شروانی نے یہ مطالب مولانا ذکاء اللہ دہلوی کی تاریخ سے نقل فرمائے ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے الفاظ بھی پڑھ لئے جائیں۔ مولانا ذکاء اللہ ''تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ'' (ج ۵ ص ۶۷۵) میں فرماتے ہیں۔

> ''سب سے اول مولوی رحمت اللہ کرانہ سے اس ٹوہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ بڑے فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کی رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعے کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اُترے۔ اس دانش مند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن کو چلا گیا۔
>
> ''جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا، جہاد کے فتویٰ کا چرچا شہر میں بہت کم تھا۔ مساجد میں ممبروں پر جہاد کا وعظ کم تر ہوتا تھا۔ دہلی کے مولوی اور اکثر مسلمان خاندان تیموریہ کو ایسا خولہ خطبہ جانتے تھے کہ وہ ناممکن سمجھتے تھے کہ اس خاندان کی بادشاہی ہندوستان میں ہو۔ مگر اس کے ساتھ جاہل مسلمانوں کو یہ یقین تھا کہ انگریزی سلطنت

کے بدن میں یہ ایسا پھوڑا نکلا ہے کہ وہ جانبر نہیں ہو گی۔ یہ کام لُچے شہدے مسلمانوں کا تھا کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے۔

"مگر جب بخت خاں جس کا نام اہل شہر نے کم بخت خاں رکھا تھا، دہلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ لکھایا کہ مسلمانوں پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہو گی تو وہ ان کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ اس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتویٰ پر دستخط و مہریں ان کی کرالیں اور مفتی صدر الدین نے بھی ان کے جبر سے اپنی جعلی مہر کر دی لیکن مولوی محبوب علی و خواجہ ضیاء الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں اور بیا کانہ کہہ دیا کہ شرائط جہاد موافق مذہب اسلام موجود نہیں۔ اس فتوے کا اثر یہ تھا کہ جاہل مسلمانوں میں جوش مذہبی زیادہ ہو گیا۔ جن مولویوں نے فتوے پر مہریں کی تھیں، وہ کبھی بہاڑی پر انگریزوں سے لڑنے نہیں گئے۔ مولانا نذیر حسین جو وہابیوں کے مقتدا اور پیشوا تھے، ان کے گھر میں تو ایک میم چھپی بیٹھی تھی۔"

اس فتوے پر کچھ مہریں اصلی کچھ جعلی تھیں۔ ایک مولوی کی مہر تھی جو غدر سے پہلے قبر میں سو چکا تھا۔ اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ تنہا بخت خاں فتوے جہاد کا ذمہ دار ہے اور اسی نے جامع مسجد میں تمام مولویوں کو جمع کر کے فتوے پر دستخط کرائے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ کی اسی تاریخ (جلد ۵ ص ۶۸۱) سے پتہ چلتا ہے کہ جولائی کے شروع میں بخت خاں بڑی سلیقہ مندی اور ہوشیاری سے دہلی میں آیا۔ لہٰذا فتویٰ جہاد کو ماہ جولائی سے پہلے معرض وجود میں نہ آنا چاہیے۔ مولانا شروانی نے اپنی کتاب (ص ۱۵۵) میں منشی جیون لال کے روزنامچے سے نقل کیا ہے کہ ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کو مولانا خیر آبادی شریک دربار ہوئے اور اشرفی نذر میں پیش کی اور صورت حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ علامہ الور سے نشر و اشاعت کرتے ہوئے اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے (ص ۱۴۵)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کے بعد مندرجہ بالا فتویٰ مرتب ہو کر شائع ہوا۔

ابھی حال میں ڈاکٹر اطہر عباس صاحب ایم۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہندی کتاب "سوتنتر دہلی" ۱۸۵۷ء کی یادگار میں حکومت یوپی نے شائع کی ہے۔ اس کے آخر میں بہت سے اہم کاغذات کے عکس بھی چھاپ دیئے گئے ہیں۔ ان کے منجملہ "صادق الاخبار" دہلی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء کا فوٹو بھی ہے۔ اس کے ایک صفحہ پر فتویٰ جہاد بھی موجود ہے۔ مدیر اخبار نے اس فتوے کی سرخی یہ دی ہے۔ "نقل استفتاء از اخبار الظفر دہلی اُردو" اور اس کے بعد حسب ذیل عبارت نقل کی ہے۔

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دہلی پر چڑھ آئے اور اہل اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں اب شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں اور اگر فرض ہے تو وہ فرض عین ہے یا نہیں اور لوگ جو اور شہروں اور بستیوں کے رہنے والے

ہیں۔ ان کو بھی جہاد چاہیے یا نہیں۔ بیان کرو۔ اللہ تم کو جزائے خیر دے۔

جواب: درصورت مرقومہ فرض عین ہے۔ اوپر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اب اس شہر والوں کو طاقت مقابلہ اور لڑائی کی ہے۔ بسبب کثرت اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلات حرب کے تو فرض عین ہونے میں کیا شک رہا اور اطراف وحوالی کے لوگوں پر جو دور ہیں۔ باوجود خبر کے فرض کفایہ ہے۔ ہاں اگر اس شہر کے لوگ باہر ہو جائیں مقابلے سے یا سُستی کریں اور مقابلہ نہ کریں تو اس صورت میں ان پر بھی فرض ہو جاوے گا اور اسی طرح اور اسی ترتیب سے سارے اہل زمین پر شرقاً اور غرباً فرض عین ہو گا اور جو عدوان بستیوں پر ہجوم اور قتل اور غارت کا ارادہ کریں تو اس بستی والوں پر بھی فرض ہو جائے گا۔ بشرط ان کی طاقت کے۔ العبد المجیب احقر نور جمال عفی عنہ۔"

اس جواب کے نیچے حسب ذیل ۳۳ علماء کے دستخط ہیں:
(۱) محمد نذیر حسین (۲) رحمت اللہ (۳) مفتی صدر الدین (۴) مفتی اکرام الدین معروف سید رحمت علی (۵) محمد ضیاء الدین (۶) عبدالقادر (۷) احمد سعید احمدی (۸) محمد میر خاں یا میر محمد خان (۹) محمد عبدالکریم (۱۰) سکندر علی (۱۱) محمد کریم اللہ (۱۲) مولوی عبدالغنی (۱۳) محمد علی (۱۴) فرید الدین (۱۵) محمد سرفراز علی (۱۶) سید محبوب علی جعفری (۱۷) محمد حامی الدین (۱۸) سید احمد علی (۱۹) الٰہی بخش (۲۰) محمد مصطفیٰ خاں ولد حیدر شاہ نقشبندی (۲۱) محمد انصار علی (۲۲) مولوی سعید الدین (۲۳) حفیظ اللہ خاں (۲۴) محمد نور الحق (۲۵) سراج العلماء ضیاء الفقہا مفتی عدالت العالیہ محمد رحمت علی صاحب (۲۶) اللہ الغنی وانتم الفقل (۲۷) حیدر علی (۲۸) سیف الرحمٰن (۲۹) سید عبدالحمید (۳۰) محمد ہاشم (۳۱) سید محمد (یا حافظ کو مربع لکھ کر بیچ میں نام لکھا ہے) (۳۲) محمد امداد علی (۳۳) خادم شرع شریف رسول الثقلین قاضی القضات محمد علی حسینی۔

اس سے دو باتیں بالکل متعین ہو جاتی ہیں۔

۱۔ پہلی یہ کہ زیر بحث فتویٰ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء سے پہلے "اخبار الظفر" دہلی میں اور اس تاریخ کو "صادق الاخبار" دہلی میں شائع ہوا تھا۔ جبکہ مولانا خیر آبادی کو دہلی میں آنے کے لیے ابھی کم از کم بیس دن درکار تھے۔

۲۔ دوسری یہ کہ چونکہ یہ فتویٰ مولانا کے ورود دہلی سے پہلے مرتب ہو کر شائع ہو چکا تھا، اس لئے اس پر مولانا خیر آبادی کے دستخط نہیں ہو سکتے تھے۔

اس کے بعد مولانا خیر آبادی کا اپنا بیان پڑھیے۔ وہ "رسالہ غدریہ" (ص ۳۶۴) میں فرماتے ہیں:

"یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علماء زہاد

اور آئمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر جدال وقتال (اور غزا و جہاد) کے لیے اُٹھ کھڑی رہی۔"

اس بیان میں مولانا نے علماء زہاد اور آئمہ اجتہاد کے فتویٰ دینے کا تو ذکر کیا ہے مگر اپنا حوالہ بالکل نہیں دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شریک فتویٰ بھی ہوتے تو جیسا کہ آگے چل کر (ص ۳۷۸) ارباب حکومت کو اپنے مشورے دینے کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ یہاں بھی فتوے کی طرف کچھ نہ کچھ اشارہ ضرور کرتے اور اس شق کے ثابت ہو جانے کے بعد پھر شق نمبر ۷ کو بھی کالعدم ماننا چاہیے۔ ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولانا خیر آبادی کے خلاف گواہی دینے والے نے نہیں بلکہ خود مولانا خیر آبادی نے غیر شرعی شوقِ شہادت سے مجبور ہو کر ایسا جھوٹ بولا تھا جو اگر باور کر لیا جاتا اور اس کے مطابق انہیں پھانسی کی سزا دے دی جاتی تو وہ ایک طرح کی خودکشی کے مرتکب قرار پاتے۔

(۲) اب شق نمبر دو اور تین کو لیجیے۔ خود مولانا شروانی نے "سیر العلماء" کی جو عبادت نقل کی ہے، اس سے یہ بات ثابت ہے کہ مولانا پر باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا تھا۔ مولانا نے اس مقدمے کی بھرپور پیروی کی تھی اور ان کے بڑے بیٹے مولانا عبدالحق خیر آبادی کی درخواست پر مولوی نبی بخش صاحب، مولوی قادر بخش صاحب اور مولوی سید ضامن حسین صاحب شہادت صفائی کے لیے لکھنؤ گئے تھے اور منشی کرم احمد خیر آبادی اس مقدمے کے پیروکار تھے۔

اگر مولانا خیر آبادی کا منشا ہی سزا پانا ہوتا تو وہ یہ سب کچھ کیوں کرتے اور اگر ان کی خواہش کے خلاف ان کے بیٹوں اور اعزا و احباب کی طرف سے کیا گیا ہوتا تو خود اپنی برات ثابت کرنے کے لیے عدالت میں بحث نہ کرتے اور کم از کم اس لطف کی بات کے موجد تو ہرگز نہ ہوتے کہ خود ہی چند الزام اپنے اوپر قائم کرتے اور پھر خود ہی مثل تارِ عنکبوت عقلی و قانونی ادلہ سے توڑ دیتے۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا نے عدالت میں جو کچھ اپنی صفائی میں کہا سنا اور جس قدر سعی و کوشش اُن کے اعزا نے کی، اس سے مقصود انگریزوں کے ظلم و ستم کو اور نمایاں کرنا اور دنیا کو یہ دکھانا تھا کہ باوجود مولانا کی برأت ثابت ہو جائے کہ انہیں ظلماً سزا دی گئی مگر مولانا شروانی کا یہ ارشاد کہ مولانا خیر آبادی نے سب کچھ ثابت کر دینے کے بعد خود ہی اقرار جرم کر لیا، اس جواب کو رد کر دیتا ہے، کیونکہ اس اقرار سے انگریزی حکام کی بیداد کا مطلق اظہار نہیں ہوتا۔

(۳) رہی یہ بات کہ جج مولانا کا ہمدرد تھا اور چاہتا تھا کہ انہیں بری کر دے تو یہ بات خود مولانا خیر آبادی کے بیان کے خلاف ہے۔ وہ "رسالہ غدریہ" (ص ۴۱۷) میں فرماتے ہیں کہ:

"میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا گیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا۔ اس ظالم حاکم نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا اور میری کتابیں، جائداد، مال و متاع اور اہل و عیال کے رہنے کا امکان غرض ہر

چیز پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔''

(۴) یہی صورت احوال مولانا شروانی کے اس ارشاد کی ہے کہ مخبر نے عدالت کا رخ اور علامہ کی بارعب و پُر وقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں، وہ دوسرے تھے کیونکہ مولانا خیر آبادی نے مذکورہ بالا بیان میں یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''میری چغلی ایسے دو مرتد، جھگڑالو، تند خو افراد نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مودت و محبت پر مصر تھے۔ انہوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔''

اگر مخبر عدالت میں مولانا کے حق میں گواہی دے چکا تھا تو مولانا کا جزائر انڈیمان میں بیٹھ کر اُسے مرتد، جھگڑالو اور تند خو کہنا ان کی شان کے قطعاً خلاف تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بھی واقعہ کے خلاف ہے۔

(۵) جہاں تک مولانا خیر آبادی کے استقلال اور بلند ہمتی کا تعلق ہے اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ وہ شوق شہادت میں ناکردہ گناہ سزا پانا چاہتے تھے تو یہ ان کے تمام صاف اور صریح بیانوں کے خلاف ہے۔ وہ قصیدہ ہمزیہ میں افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھ رہا۔ میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقع پر باز رہا۔ یہ میں نے بڑا جرم کیا۔ پس جب کہ نیک بخت حضرات شہید ہوئے تو میں شہادت سے محروم رہا۔ اے پروردگار! میرے قصور کو معاف کر، تجھ سے عفو و درگزر ہی کی امید ہے اور اگر یہ کہا جاوے کہ انہوں نے تلافی مافات کے خیال سے اب شہید ہونے کی تدبیر نکالتے ہوئے، اقرار تحریر فتویٰ کیا تھا تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ انہوں نے اپنے دونوں قصیدوں اور ''رسالہ غدریہ'' میں جگہ جگہ نصاریٰ کے ظلم و استبداد، ملکہ وکٹوریہ کے غدر و مکر اور مخبروں کے جھوٹ اور فریب کو اپنے تمام مصائب کا سبب قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بے حد تضرع و زاری کے ساتھ دعائیں کی ہیں کہ وہ انہیں قید اور اس کے عذابوں سے جلد از جلد نجات دے کر بخیر و عافیت اہل و عیال تک واپس پہنچا دے، لہٰذا یہ کہنا کہ مولانا خیر آبادی نے خود اقرار جرم کیا اور خوشی خوشی قید و بند کے مصائب کو اپنے اوپر لادا، کسی طرح بھی اُن کے خیالات کی ترجمانی نہیں ہے۔

خوش قسمتی سے کتاب خانہ رام پور میں مولانا خیر آبادی کا ایک خط محفوظ ہے۔ اس سے مولانا کے اسباب قید و بند اور مدارج سعی و کوشش رہائی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں اسے نقل کیا جاتا ہے۔ تاکہ اہل تاریخ صحیح صورتحال سے آگاہ ہو جائیں۔ خط یہ ہے۔

جناب عالی قباب نواب صاحب خداوند نعمت فیاض زمان

ملاذ و معاذ علمائے دوراں دام اقبالہ

بعز عرض............... میر ساند

کہ پیش ازیں دوتا عریضہ عقیدت مشتمل برابتلائی خویش ارسال عالی جناب کردہ ام بہ نظر اشرف نہ گذشتہ کاشف مخاوی مندرجہ شدہ باشد، دم روبکاری ایں جا واضح شد کہ فدوی رابعلت نوکری خان بہادر خان و نظامت پیلی بھیت وچکلہ داری محمدی وافسری لشکر باغی ماخوذ کردہ اند در حال آنکہ۔ فدوی ہر سہ امر محض بری ست و منشا مواخذہ آنست کہ شخصے میر فضل حق نام از سادات شاہ جہان پور کہ قبل ازیں در سرکار ابد قرار بندگان عالی ملازم ماندہ بسرشتہ داری پیلی بھیت مامور شدہ، وزمانے تحصیل دار آنولہ و پیلی بھیت ماندہ بود، درابتدای غدر از طرف خان بہادر خان ناظم پیلی بھیت گردید، بعد فتح بریلی در ملک اودھ رسیدہ از طرف خان علی خان چکلہ دار محمدی شدہ پس از زمانی بافسری کدامی لشکر باغی ہمراہ فیروز شاہ آن طرف جمن فرار کرد، عزیزان اودسرکار کمپنی بعہد ہای جلیلہ مامورند، چنانچہ برادر حقیقی او مولوی مبین ڈپٹی کلکٹر سہارنپور بود۔ مہتمان اخبار خانہ خراب ناواقف ازیں تفصیل کہ او شخصی دیگرست، وفدوی از شیوخ خیرآباد شخصی دیگر در اخبار نامہا حال نظامت پیلی بھیت ومحمدی وافسری لشکر و فرار او بافیروز شاہ آن طرف جمن نوشتہ حقیقی او در سرکار مہاراجہ پٹیالہ نوکر و در اور دیگرش در سہارنپوری ڈپٹی کلکٹر است حاکمان اینجا باشتباہ ہمان مولوی فضل حق کو ہمنام دور بعضے علامات شریک فدوی ست، فدوی را محض بے جرم مقید کردہ اند۔ لہٰذا عرض رساست کہ اسماعیل خان رئیس مالاگڑھ دریں روز ہادار دآن وبارند واز حال فدوی و مولوی فضل حق شاہ مہانپوری مذکور بخوبی واقف، بایشان ایماروند تا ایشان کیفیت تفصیلی مشارالیہ و حال عبور او دریای جمن راہمراہ فیروز شاہ و حال بے جرمی فدوی نوشتہ مع عرضی خود بنام ترپ صاحب کمان افسر بریلی متضمن درخواست ارسال کیفیت مذکورہ بذریعہ چٹھی خود در محکمہ اسپیشل کمشنر لکھنؤ خدمت ترپ صاحب موصوف روانہ دارند و در کیفیت تغائر بسیار میان فدوی و فضل حق شاہ جہان پوری ثابت سازند و نوکر نبودن فدوی بسرکار کرامی باغی وافسر نبودن فدوی بکدامی لشکر و ناظم نماندن فدوی بعلاقہ پیلی بھیت و محمدی ایں جملہ امور واقعی ست بوجہ احسن ثبت کنند تا صاحب موصوف عرضی و کیفیت مرسلہ ایشان راہمراہ چٹھی خود ربنجا روانہ فرمانید، وبواسطہ آن چٹھی و کیفیت اشتباہ حکام اینجا وقع شود ونمک خوار قدیم رہائی یافتہ بدعای ترقی حشمت و جاہ؟ گردد از پرورش خاوندانہ و مواسات کریمانہ امیدوار است توجہ بسیار بحال زارم مبذول شور و بعجلت پرچہ تمامتر اثر اجازت مسئول ظاہر گردد۔ واجب بود عرض نمود۔ آفتاب ترقی جاہ جلال ہموارہ تابان باد۔

ترقی طلب

عرضے

مہر (فضل حق ۱۲۲۴) نمک خوار قدیم ۱۸۔ فروری

مولانا نے یہ عریضہ لکھنؤ سے نواب یوسف علی خان بہادر والی رام پور کو لکھا تھا۔ چونکہ نواب صاحب کا

رویہ انگریزوں کے موافق رہا تھا، اس لئے یہ امید کی جاسکتی تھی کہ وہ کوشش اور سفارش کریں گے تو انگریزی قید و بند سے نجات مل سکے گی، اس لئے مولانا نے انہیں یکے بعد دیگرے تین خط لکھے۔ دو خط محفوظ نہ رکھے یا محفوظ نہ رکھے گئے۔ تیسرا خط پہلی بار اہل تاریخ کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔

اس خط سے حسب ذیل امور ہمارے علم میں آتے ہیں:

۱۔ مولانا خیر آبادی نے ابتلا کے سلسلہ میں نواب رام پور کو تین خط لکھے تھے۔ چونکہ آخری خط میں ان سے مدد کی خواہش کی گئی ہے، اس لئے قیاس یہ ہے کہ پہلے دو خطوں میں بھی اسی قسم کی تمنا کا اظہار کیا گیا ہوگا۔

۲۔ مولانا پر حسب ذیل تین الزام عائد کئے گئے تھے۔

(الف) نواب خان بہادر خاں، نبیرۂ حافظ رحمت خان بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں بغاوت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔

(ب) جب انگریزوں نے بریلی فتح کر لی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر اودھ پہنچے اور خان علی خاں کی طرف سے ریاست محمدی کے چکلہ دار مقرر ہوئے۔

(ج) مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔

۳۔ مولانا پر جو مذکورہ بالا تین الزام لگائے گئے تھے، یہ دراصل میر فضل حق شاہ جہان پوری کے کارنامے تھے، مولانا ان سے بری الذمہ تھے۔

۴۔ مخبروں نے ہم نامی کی بنا پر دھوکا کھایا اور اپنی خفیہ رپورٹوں میں اتنا اور اضافہ کر دیا کہ ان کا ایک بھائی مہاراجہ پٹیالہ کا ملازم ہے، جو ایک امر واقعی تھا۔

۵۔ اگر کسی طرح ان الزاموں کا غلط ہونا یعنی ان جرموں کا میر فضل حق شاہ جہان پوری سے تعلق ثابت ہو جاتا تو مولانا بری ہو جاتے۔

۶۔ لہٰذا مولانا نے نواب صاحب سے انتہائی عاجزی و زاری کے ساتھ مدد کی التجا کی تھی۔

۷۔ مولانا کا یہ خط ۱۸۔ فروری ۱۸۵۹ء کا نوشتہ ہے اور انہیں ۲۰ فروری کو حکم سزا (حبس دوام بعبور دریائے شور) سنایا گیا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ آخری وقت تک اپنی رہائی کے اسباب کی تلاش میں لگے رہے۔

ان امور کے پیش نظر یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ مولانا خیر آبادی پر تحریر فتویٰ کا الزام عائد نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اُن پر غدر دہلی سے متعلق کوئی الزام بھی نہ لگا تھا اور جو الزام عائد کئے گئے تھے، وہ دراصل دوسرے مولوی فضل حق کے کام تھے۔ یہ ان سے بالکل بری الذمہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب عدالت میں مخبر پیش ہوئے، تو بقول مولانا شروانی، انہوں نے مولانا کے متعلق صاف کہہ دیا کہ یہ وہ فضل حق نہیں ہیں، وہ دوسرے تھے، مگر انگریز پر جبر کا بھوت سوار تھا۔ حاکم نے اس شبہ کا فائدہ مولانا کو صرف اتنا دیا کہ انہیں پھانسی کی جگہ حبس دوام

بعبور دریائے شور کی سزا دے دی۔

فتوائے جہاد کی اصلیت

پچھلے صفحات میں صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا خیرآبادی کا جہاد کے فتوے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اب اس پر بھی غور کرنا ہے کہ کیا حقیقت میں جہاد کا فتویٰ دہلی کے علماء کی طرف سے چھاپا گیا تھا یا باغی سپاہیوں نے عوام اور اہل اسلام کو اپنے ساتھ ملا کر بغاوت کو کامیاب بنانے کے لیے یہ چال چلی تھی۔

اس نقطے پر سب سے پہلے سرسید نے اپنی کتاب ''اسباب سرکشی ہندوستان'' (ص ۷ طبع آگرہ ۱۸۵۹ء) میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دلی میں جو جہاد کا فتویٰ چھپا، وہ ایک عمدہ دلیل جہاد کی سمجھی جاتی ہے مگر میں نے تحقیق سنا ہے اور اس کے اثبات پر بہت دلیلیں ہیں کہ وہ محض بے اصل ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ جب فوج نمک حرام میرٹھ سے دلّی میں گئی تو کسی شخص نے جہاد کے باب میں فتویٰ چاہا۔ سب نے فتویٰ دیا کہ جہاد نہیں ہو سکتا اگرچہ اس پہلے فتوے کی میں نے نقل دیکھی ہے مگر جب کہ وہ اصل فتویٰ معدوم ہے تو میں اس نقل کو نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک لائق اعتماد کے ہے۔

مگر جب بریلی کی فوج دلّی میں پہنچی اور دوبارہ فتویٰ ہوا جو مشہور ہے اور جس میں جہاد کرنا واجب لکھا ہے، بلاشبہ اصلی نہیں، چھاپنے والے اس فتوے کے جو ایک مفسد اور نہایت قدیمی بدذات آدمی تھا، جاہلوں کو بہکانے اور ورغلانے کو لوگوں کے نام لکھ کر اور چھاپ کر اس کو رونق دیا تھا۔ بلکہ ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا مگر مشہور ہے کہ چند آدمیوں نے فوج باغی بریلی اور اُس کے مفسد ہمراہیوں کے جبر اور ظلم سے مہریں بھی کی تھیں۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ آغاز سرکشی میں دہلی کے علما سے فتویٰ مانگا گیا تو انہوں نے عدم وجوب کا فتویٰ دیا۔

۲۔ اس فتوے کی نقل سرسید نے بچشم خود دیکھی تھی۔

۳۔ مگر فوج بریلی کے ورود کے بعد ایک مفسد نے وجوب جہاد کا فتویٰ بہت سے اہل علم کی مہروں کے ساتھ شائع کیا۔

۴۔ یہ فتویٰ جعلی تھا، اس لئے کہ اس پر ایک آدھ مہر ایسے شخص کی بھی چھاپی گئی تھی جو قبل غدر مر چکا تھا۔

۵۔ مشہور یہ ہے کہ کچھ عالموں نے جبر اور ظلم کے تحت اپنی مہریں لگادی تھیں۔

سرسید کے بعد مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے ''تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ'' (ج ۵ ص ۶۷۵) میں اس فتوے کا ذکر کیا ہے۔ ان کی مطلوبہ عبارت آغاز مضمون میں نقل کی جاچکی ہے۔ یہاں صرف ضروری حصہ نقل کرنا کافی ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

''جب بخت خاں...... دہلی میں آیا تو اس نے یہ فتویٰ لکھا کہ مسلمانوں پر جہاد...... فرض ہے۔...... اُس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کر کے جہاد کے فتوے پر دستخط و مہریں اُن کی کرالیں اور مفتی صدرالدین نے بھی اُس کے جبر سے اپنی جعلی مہر کردی۔ لیکن مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیاء الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں...... اس فتوے پر کچھ مہریں اصلی، کچھ جعلی تھیں۔ ایک مولوی کی مہر تھی جو غدر سے پہلے قبر میں سو چکا تھا۔''

اس عبارت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ فتویٰ جبراً حاصل کیا تھا' اسی لئے کچھ مہریں جعلی ہیں اور جو اصلی ہیں وہ خود اختیاری نہیں بلکہ جبری ہیں۔ چونکہ سرسید نے اس زمانے میں یہ کتاب لکھی تھی۔ جب انگریز قوم سخت برہم تھی اور ان کا مقصد اس قوم کے غصے کو ٹھنڈا کرنا تھا، اس لئے انہوں نے پہلے عدم وجوب کے فتوے کا ذکر کیا اور پھر وجوب کے فتوے کو بے اصل ٹھہرا کر اہل علم کی صفائی پیش کردی۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب کا منشا بھی علماء اسلام کو انگریزوں کے کینے سے محفوظ رکھنا تھا، اس لئے انہوں نے بھی سرسید کی ہمنوائی کر کے جعل اور جبر کی سپر سامنے کردی لیکن اس وقت کے حالات کو بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ دستخط کرنے والوں میں کچھ اہل علم ایسے بھی تھے جو دل و جان سے انگریزی تسلط کے مخالف تھے اور انگریزوں کے خلاف جنگ کو مذہباً ضروری جانتے تھے، اس لئے انہوں نے یہ فتویٰ مرتب کیا اور اپنے اختیار اور رضا مندی سے دستخط کئے۔ بقیہ نے مجبوراً توثیق کی۔ شکست کے بعد جان بچانے کی صرف یہی ایک تدبیر باقی تھی کہ جبر کی پناہ لی جائے۔ اس بنا پر جس سے باز پرس ہوئی، اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

اس کے ثبوت میں مولانا خیرآبادی کی حسب ذیل عبارت دوبارہ پڑھیے کہ ''بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علماء و زہاد اور آئمہ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر غزا و جہاد کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔'' اگر فتویٰ مطلقاً جعلی و جبری ہوتا تو مولانا اپنی نجی روداد غم میں اس امر کا ضرور تذکرہ کرتے یا کم از کم ایسا پرداز اختیار نہ کرتے جس سے فتوے کے اصلی ہونے کا یقین ہوتا ہے۔

آزردہ اور جبر

مولانا شروانی نے صدرالدین خان آزردہ کے فتوے پر دستخط کرنے کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے اور اس سے مولانا خیرآبادی کی بلند ہمتی اور آزردہ کی پست ہمتی و عیاری کا جو نتیجہ نکالا ہے، اس سے قطع نظر کرتے ہوئے مجھے اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ جو لکھا ہے کہ آزردہ نے فتوے پر دستخط کرنے سے پہلے ''شھدت بالجبر'' لکھ دیا تھا۔ یہ بات دو وجوہ سے درست نہیں۔

۱۔ پہلی یہ کہ یہ موقع گواہی کا نہ تھا۔ جو آزردہ ''شھدت'' لکھتے، بلکہ توثیق جواب کا تھا، اس لئے کم از کم ''کتبت'' لکھنا چاہتے تھے جس کا مطلب تھا، میں نے لکھا۔

۲۔ دوسری یہ کہ فتوے کی جو نقل "صادق الاخبار" میں چھپی ہے، اس میں مولانا کی مہر کے آگے پیچھے سرے سے کوئی عبارت ہی نہیں ہے۔

اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ "شہدت بالجبر" واقعہ نہیں ہے، لطیفہ ہے۔

مولانا خیر آبادی کی دوسری بیوی

آخر میں اتنا اور کہہ دوں کہ کتاب خانہ رام پر میں ایک فارسی خط مولانا خیر آبادی کی دوسری بیوی کا بھی محفوظ ہے، جو انہوں نے ۹ صفر ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) کو نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں والی رام پور کے نام لکھا تھا اور اپنی مالی پریشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان سے امداد چاہی تھی۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خاتون کا نام امراؤ بیگم تھا اور اس زمانے میں وہ دہلی کے اندر محلّہ بلّی ماران، بارہ دری شیر افگن خاں میں رہتی تھیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے اُن بطن سے دو بیٹے تھے، جن کے نام محمد شمس الحق اور محمد علامہ الحق تھے۔

حواشی

۱۔ باغی ہندوستان نام ہے۔ مولانا خیر آبادی کے ایک عربی رسالے موسوم بہ "رسالہ غدریہ" کے مترجم ایڈیشن کا۔ یہ ترجمہ مع ایک مفصل دیباچے کے اس کے مترجم مولانا شروانی نے ۱۹۴۷ء میں مدینہ پریس بجنور سے شائع کرایا تھا۔ اب یہ نسخہ کم یاب ہے۔

۲۔ یہ جملہ معنوی اعتبار سے محلِ نظر ہے، کیونکہ جہاں تک میرا علم ہے۔ فتوے کی توثیق کرتے ہوئے یہ لفظ استعمال نہیں کئے جاتے بلکہ اس کی جگہ کوئی ایسا جملہ جس کا مطلب مجیب کی رائے کو درست بتانا ہو، لکھا جاتا ہے۔ ہر حال اس سے آئندہ بحث کی جائے گی۔

☆......☆......☆

مالک رام

مولانا فضل حق خیرآبادی

مولانا فضل حق خیرآبادی (۱۷۹۸ء۔۱۸۶۱ء) اپنے عہد کے مشہور علماء میں سے تھے، بلکہ معقولات میں تو آخری دور کے امام مانے جاتے ہیں۔ یہ امتیاز ان کے خاندان میں بہت دن تک رہا اور آج ان کا نام علمی اور تعلیمی حلقوں میں ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔

اگر اسی پر اکتفا کر لیا جاتا تو یہ بھی کچھ کم نہیں تھا لیکن ان کے ماننے والوں نے اس پر قناعت نہ کی اور چاہا کہ انہیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو اور ''فضل الجہاد کلمۂ حق عند سلطان جائر'' کا مصداق بھی قرار دیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں ان پر جو مقدمہ قائم ہوا تھا اور جس میں آخر کار انہیں کالا پانی کی سزا ہوئی تھی، اس کی روداد کچھ ایسے انداز میں لکھی گئی کہ اس میں تاریخ سے زیادہ ڈرامہ کا لطف پیدا ہو گیا۔

سب سے پہلے ان کے مقدمے کی مفروضہ کارروائی اور اس میں ان کے متہورانہ دفاع سے متعلق شبہہ اس وقت پیدا ہوا جب مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مضمون ''مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد'' میں مولانا مرحوم کا ایک خط شائع کیا، جو انہوں نے فردوس مکان نواب یوسف علی خان والی رام پور کو لکھا تھا۔ اس خط سے ثابت ہوتا تھا کہ نہ صرف انہوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ وہ آخر تک اس سے اپنی بے تعلقی اور عائد کردہ الزامات سے بے گناہی ثابت کرنے کیلئے پوری تگ و دو کرتے رہے۔ ان کے مقدمے کی جو کیفیت آج تک شائع ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ مولانا فضل حق مرحوم پر یہ مقدمہ ''سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری یا فتوی جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت'' کی بنا پر قائم ہوا تھا۔

۲۔ جس جج کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تھا، وہ ان کا شاگرد تھا اور اس لئے اسے ان سے ہمدردی تھی اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ یہ بری ہو جائیں۔

۳۔ جیوری میں ایک اسیر بھی مولانا کو بری کر دینے کے حق میں تھا۔

۴۔ مولانا فضل حق نے خود استغاثہ کے بیانات اور دلائل ''مثلِ تارِ عنکبوت عقلی و قانونی ادِلّہ'' سے توڑ دیئے

تھے اور امید تھی کہ وہ بری کر دیئے جائیں گے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اقرار کیا کہ جس فتوے کی بنا پر یہ مقدمہ قائم ہوا ہے، ''وہ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی، میری وہی رائے ہے۔''

۵۔ اس اقرار و اقبال کے بعد عدالت نے ''بے حد رنج کے ساتھ'' حبس دوام بہ عبور دریائے شور کا حکم سنایا۔

۶۔ یہ فیصلہ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سُنا۔

افسوس کہ واقعات سے یہ تمام دعاوی ٹھیک ثابت نہیں ہوتے۔

مولانا فضل حق کے مقدمے کی ابتدائی سماعت کپتان ف۔ا۔وتھربرن لکھنو نے کی تھی۔ یہ مقدمہ ۲۲ فروری ۱۸۵۹ء کو ان کی عدالت میں پیش ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے پانچ گواہ تھے۔ (۱) عبدالحکیم اکسٹرا اسسٹنٹ دریابرد۔ (۲) تجمل حسین (۳) فضل حسین (۴) رام دیال (۵) مرتضیٰ حسین۔

سب سے پہلے عبدالحکیم نے بیان دیا۔ اس نے کہا:

''مئی ۱۸۵۸ء میں جن دنوں میں کار سرکار پر دریاباد میں متعین تھا، منتظم حسین نے مجھے گرفتار کر لیا اور بیگم حضرت محل کے پاس بھیج دیا جو ان دنوں بوندی میں مقیم تھیں۔ یہاں مجھے مموخان اور مولوی فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا۔ مموخان نے مولانا فضل حق سے دریافت کیا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔''

مولانا نے ''فتویٰ'' دیا کہ یہ شخص فرنگیوں کا ملازم ہے، اس لئے سزائے موت کا مستحق ہے۔ اسے بلاتاخیر موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے۔ اس پر کاظم علی نے جو وہاں موجود تھا، یہ مشورہ دیا کہ اسے قتل کرنے کی بجائے قید کر دیا جائے، چنانچہ میں قید خانے بھیج دیا گیا۔ یہاں میں ایک مہینہ بائیس دن رہا۔ آخر کار مجھے تجمل حسین (ساکن تبوہ مئو) اور بعض اور اشخاص کی سفارش پر رہائی ملی۔ اس زمانے میں مولوی فضل حق کیمپ میں موجود نہیں تھے۔ یہ مولوی احمد اللہ شاہ کی جائداد کی ضبطی کے لیے باہر گئے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ وہاں ہوتے تو مجھے کبھی رہائی نصیب نہ ہوتی۔

مولوی فضل حق، مموخان کے مشیر اور اس کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ چونکہ ان کا خیمہ اس کے خیمے کے نزدیک تھا، جس میں مجھے قید کیا گیا تھا، اس لئے میں انہیں دیکھا کرتا تھا۔ یہ کثرت سے مموخان کے پاس جایا آیا کرتے تھے۔ میں انہیں خوب پہچانتا ہوں۔ انہی نے میری موت کا فتویٰ دیا تھا۔

سوال: (از مولانا فضل حق): کیا تم اپنے بیان کے ثبوت میں کوئی شہادت پیش کر سکتے ہو؟

جواب: ہاں، چوہدری مرتضیٰ حسین جو میرے ساتھ قید میں تھے اور شیخ عبدالعلی (گولہ گنج والے) میری تصدیق کریں گے۔

سوال: (از مولانا فضل حق): کیا کسی سُنّی کا فتویٰ شیعہ کے لیے قابل قبول ہوگا؟

جواب: بغاوت کے دنوں میں سُنّی شیعہ کا امتیاز اٹھ گیا تھا۔

عبدالحکیم کا بیان ختم ہوا تو تجمل حسین کی طلبی ہوئی۔ اس نے حسب ذیل گواہی دی۔

''میں بحکم سرکار مئی ۱۸۵۸ء میں عبدالحکیم کی رہائی کے لیے بونڈی گیا تھا، جہاں ان دنوں ممو خان اور حضرت محل اور برجیس قدر مقیم تھے۔ وہاں میں نے مولوی فضل حق کو باغیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ یہ ممو خان کے مشیروں میں شمار ہوتے تھے اور اسی حیثیت سے اس کے دربار میں موجود رہتے تھے۔ میں باغی ڈیرے میں کوئی ڈیڑھ مہینہ رہا۔ مجھے وہاں پہنچے مہینہ بھر ہوا ہو گا کہ مولوی فضل حق اور میر مہدی، مولوی احمد اللہ شاہ کی جائداد ضبط کرنے کو محمد لی گئے۔''

میں مولوی فضل حق کو پہچانتا ہوں۔

مجھے یہ معلوم نہیں کہ آیا یہ باغی حکومت کے ملازم تھے یا نہیں، نہ مجھے اس کا علم ہے کہ ممو خان ان پر اعتماد کرتا تھا یا نہیں۔

ہاں: ایک اور فضل حق بھی ہیں۔ میں جس زمانے میں بونڈی کے باغی کیمپ میں تھا، وہ بھی دو دن کے لیے وہاں آیا تھا اور اس کے بعد خان علی ناظم شاہ جہان پوری کے پاس واپس چلا گیا۔

اس زمانے میں دونوں سنیوں اور شیعوں کے فتوے قبول کر لئے جاتے تھے لیکن میں نے ان مولوی فضل حق کا کوئی فتویٰ نہیں دیکھا۔

استغاثے کا تیسرا گواہ فضل حسن تھا۔ اس نے مولانا حق کو شناخت کیا اور کہا:

''یہ خیر آباد کے رہنے والے ہیں۔ آج سے دس بارہ برس پہلے یہ واجد علی شاہ کے ہاں ملازم تھے۔ جب آٹھ مہینے پہلے بیگم حضرت محل، بھاگ کے بونڈی گئی ہیں تو میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے مولوی فضل حق کو دیکھا۔ یہ وہیں قلعے کے اندر بیگم کی جائے سکونت کے شمال کی طرف ایک عمارت میں مقیم تھے۔ میں انہیں وہاں کوئی دو مہینے تک دیکھتا رہا۔ یہ ممو خاں کے دربار میں روزانہ جاتے تھے اور 'مولوی خان' کے نام سے پکارے جاتے تھے۔''

اس کے بعد رام دیال گواہ پیش ہوا۔ اس نے بیان دیا:

''پانچ مہینے کی بات ہے کہ میں نے مولوی فضل حق کو بونڈی میں دیکھا جہاں بیگم (حضرت محل) فوج کے ساتھ پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔ یہ (مولوی فضل حق) ممو خاں کے دربار میں حاضری دیتے تھے۔ جس دن عبدالحکیم گرفتار ہو کر آیا تھا، میں (دربار میں) موجود تھا۔ جب عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین کو ممو خان اور مولوی فضل حق کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے (یعنی مولوی فضل حق نے) ان دونوں سے پوچھا کہ تم انگریزوں کی ملازمت کیوں کرتے ہو۔ عبدالحکیم نے جواب دیا کہ میں تو ان کا ملازم ہوں اور انہی کے ساتھ رہتا ہوں۔ مرتضیٰ حسین

نے مولوی فضل حق کو قرآن سے کوئی جواب دیا تھا۔ میں نے مموخان سے کہا کہ یہ دونوں موت کے سزاوار نہیں، انہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ مموخان نے ان کے بیان سن کر کہا کہ عبدالحکیم کو رہا کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ یہ اپنے بھائی محمد عسکری کو لے آئے۔"

"میرے سامنے کوئی فتویٰ نہیں دیا گیا، میرے آنے سے پہلے شاید دیا گیا ہو۔"

اب سب سے آخری گواہ مرتضیٰ حسین حاضر عدالت ہوا۔ اس نے کہا:

"جب مجھے عبدالحکیم کے ساتھ گرفتار کیا گیا تو اس کے تیسرے یا چوتھے دن ہمیں داروغہ مموخان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس وقت (مولوی) فضل حق اس کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ مولوی فضل حق نے مجھ سے پوچھا کیا تم پڑھ سکتے ہو۔ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ اس پر انہوں نے مجھ سے کہا کہ شرعی لحاظ سے تم مرتد ہو اور مرتد کا قتل جائز ہے۔ انہوں نے مجھے مرتد اس لئے کہا، کیونکہ میں حکومت (انگریزی) کا ملازم تھا۔ مموخان نے کہا کہ کسی طرح محمد عسکری تحصیل دار نواب گنج کو توڑا جائے اور اگر وہ آ جائیں تو انہیں اس سے دگنی تنخواہ دی جائے گی، جو انہیں اس وقت ملتی ہے۔ عبدالحکیم نے جواب میں کہا کہ میں انہیں لا تو نہیں سکتا البتہ اس مفاد کا خط ان کے نام لکھ کر دے سکتا ہوں۔ اس پر سب اٹھ کر چلے گئے اور ہمیں واپس قید خانے میں بھیج دیا۔"

اس کے چار دن بعد ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔

"پھر مموخان نے مجھے مولوی فضل حق کی جائے سکونت پر بلا بھیجا اور کہا کہ اگر تم پچاس ہزار روپیہ فوج کے خرچ کے لیے ادا کر دو تو تمہاری جان بچ سکتی ہےاور اگر نہیں ادا کرو گے تو توپ کے منہ سے اڑا دیے جاؤ گے۔"

فضل حق کے پاس خود چل کر جاتا تھا۔ مولوی فضل حق اس کے دربار میں بھی آتے تھے۔"

"میں نے سُنا تھا کہ بوندی میں کوئی شوریٰ بیٹھتی ہے، جس میں یہ مولوی فضل حق بھی شریک ہوتے ہیں۔ یہ پچھلی مئی (یعنی ۱۸۵۸ء) کی بات ہے۔"

"میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا مولوی فضل حق نے کوئی فتویٰ دیا تھا۔"

"میں دو مہینے ۲۳ دن قید خانے میں رہا اور سات ہزار روپیہ دے کر رہائی حاصل کی۔ میری رہائی کے وقت مولوی فضل حق وہاں نہیں تھے۔ یہ ان ایام میں احمد اللہ شاہ کی جائداد ضبط کرنے کو گئے ہوئے تھے۔"

میں فضل حق کو پہچانتا ہوں۔

''جب ہمیں پہلی مرتبہ ممو خان کے سامنے پیش کیا گیا ہے تو اس دن رام دیال بھی وہاں موجود تھا۔''

ان گواہوں کے بیانات کا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں اور اب اس سے کوئی فائدہ بھی مرتب نہیں ہو سکتا۔ بہر حال ان کے باہمی تضاد ظاہر ہیں۔

ان میں سے عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین، دونوں کے بیان بہت اہم ہیں اور بعد کو یہی سارے مقدمے کی بنیاد بنے۔ دوسرے لوگوں کے بیان تو محض تائیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا فضل حق نے اپنے عربی رسالے ''ثورۃ الہندیہ'' میں لکھا ہے۔

''حاکم نصرانی کے سامنے دو مرتد سخت دل دشمنوں نے میری چغلی کھائی۔ وہ دونوں قرآن کی آیت کے معانی سے متعلق مجھ سے حجت کرتے تھے، حالانکہ اس کا صاف حکم یہ ہے کہ جو نصاریٰ کا دوست ہے۔ وہ خود بھی نصرانی کے حکم میں ہے۔ وہ دونوں شخص نصاریٰ کی دوستی پر مصر تھے۔ انہوں نے ارتداد اختیار کیا اور اپنے ایمان کو کفر سے بدل لیا۔''

یہاں ان دو دشمنوں سے یہی عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین مراد ہیں، جنہوں نے ان کے خلاف گواہی دے کر بنائے مقدمہ قائم کی تھی۔

جب استغاثہ کے سب گواہوں کے بیان قلم بند ہو چکے تو خود ملزم یعنی مولانا فضل حق کی طلبی اور ان کا بیان لکھا گیا۔ انہوں نے کہا:

''میں راجہ الور کے ہاں ملازم تھا اور بغاوت شروع ہونے کے زمانے میں اسی کے پاس تھا۔ راجہ بنے سنگھ کی وفات کے بعد ایک مہینے تک میں الور میں رہا۔ میں اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے روانہ ہوا اور دہلی آیا۔ وہاں میں پندرہ دن رہا اور پھر الور واپس چلا گیا۔ میں نے اپنے اہل و عیال کو یہاں الور میں چھوڑا اور دسمبر ۱۸۵۷ء میں خیر آباد کی راہ لی۔ جب سے میں اپنے مکان پر مقیم ہوں، نہ میں نے کسی کی ملازمت کی نہ باغیوں میں شامل ہوا۔ میر فتح حسین، محمد حسین اور احمد علی خان میرے گواہ ہیں۔ نبی بخش اور قادر بخش، امام علی، علی محمد اور ممو خان خیر آباد کے رہنے والے میرے چال چلن سے واقف ہیں۔ میں خیر آباد سے اس لئے نکلا تھا، کیونکہ یہاں کے تمام باشندے بیگم (حضرت محل) کے ساتھ بھاگ گئے تھے۔ میں یہاں سے نکل کر چند دن گھیڑی ہر گاؤں، تنبول، سہور پور وغیرہ میں رہا۔ کچھ دن ڈریہ میں بھی گزارے۔ ۲۶ دسمبر ۱۸۵۸ء کو میں نے کرنیل کلارک سے سبیہا کے مقام پر ملاقات کی۔ اس سے پہلے میں بریگیڈیئر ٹروپ سے مل چکا تھا۔ بریگیڈیئر ٹروپ ہی نے مجھے کرنیل کے پاس بھیجا تھا۔ کرنیل کلارک نے ایک روبکار لکھی اور حکم دیا کہ اسے ڈپٹی کمشنر ضلع کی تحویل میں

دے دیا جائے۔ میں ۳۰ دسمبر کو ڈپٹی کمشنر کے سامنے حاضر ہوا اور اپنے مکان پر ہی ٹھہرا رہا۔
۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو ڈپٹی کمشنر نے مجھے بلا بھیجا اور لکھنؤ روانہ کر دیا۔

''فضل حق ایک اور شخص کا نام ہے، مجھے اس کی جگہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ آج کل (شاہزادہ) فیروز شاہ (بن بہادر شاہ ظفر) کے ساتھ ہے۔ یہ (فضل حق) آنولہ کا تحصیلدار تھا اور اس نے خان بہادر خان اور بیگم (حضرت محل) کی ملازمت بھی کی ہے۔ وہ ذات کا سید اور شاہ جہان پور کا رہنے والا ہے۔''

یہاں مولانا فضل حق نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ میں مہاراجہ بنے سنگھ کی وفات کے بعد ایک مہینہ تک الور میں رہا اور اگست ۱۸۵۷ء میں الور سے روانہ ہوا اور دہلی آیا اور پھر یہاں پندرہ دن رہ کے واپس الور چلا گیا۔ چونکہ مہاراجہ بنے سنگھ کی وفات ۱۵ جولائی ۱۸۵۷ء (۹ ساون سمت ۱۹۱۴ بکری) کو ہوئی تھی، اس لئے وہ ۱۵ اگست کے لگ بھگ الور سے چلے ہوں گے۔

دہلی میں ان کی دوسری بیوی جناب امراؤ بیگم تھیں۔ وہ اپنے دونوں صاحبزادوں شمس الحق اور علاء الحق کے ساتھ محلّہ بلی ماران بارہ دری شیر افگن میں مقیم تھیں۔ مولانا فضل حق اپنے عربی رسالے ''الثورۃ الہندیہ'' میں لکھتے ہیں۔

''اس وقت دہلی میں میرے بہت سے اہل و عیال مقیم تھے اور مجھے وہاں سے بلاوا بھی آ چکا تھا۔ مجھے کامیابی کی توقع تھی اور خیال تھا کہ (دہلی جانے سے) شادمانی اور مسرت حاصل ہوگی، لیکن غیب سے جو کچھ مقدر ہو چکا تھا۔ کسی کو کیا معلوم۔ بہر حال میں نے دہلی جانے کی ٹھان لی، جہاں میرا مکان تھا اور روانہ ہو گیا۔ یہاں پہنچ کے میں اپنے اہل و عیال سے ملا اور میں نے لوگوں کو (ہنگامے سے متعلق) اپنی عقل و فہم کے مطابق مشورہ دیا لیکن نہ انہوں نے میرے مشورے پر عمل کیا، نہ میرا کہا گیا۔''

یہ وہ زمانہ ہے۔ جب انگریزی فوجیں پوری طاقت سے دہلی پر حملے کر رہی تھیں اور بد قسمتی سے دیسی سپاہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ان کا مشورہ قبول کرنے کا موقع ہی کون سا تھا۔ یہاں تو نفسا نفسی کا عالم تھا۔ انجام کار دیسی سپاہ کو شکست ہوئی اور انگریز ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر میں داخل ہو گئے۔ شہر کے گلی کوچوں میں دست بدست لڑائی اس کے بعد بھی ۱۹ ستمبر تک ہوتی رہی، لیکن تا کجے، آخر کار مقابلہ ختم ہوا اور شہر پر دوبارہ مکمل انگریزی قبضہ ہو گیا۔ مولانا نے اس زمانے کے حالات یوں قلم بند کئے ہیں:

''جب نصاریٰ (یعنی انگریزوں) کا شہر پر قبضہ ہو گیا تو یہاں نہ دیسی فوج رہی، نہ کوئی شہری۔ نہ کھانے کو خوراک ملتی تھی، نہ پینے کو پانی۔ دشمنوں (یعنی انگریزوں) نے بھی ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیئے۔ میں پانچ دن رات تو شہر میں رو کا رہا۔ پھر خدا پر بھروسہ کر کے بیوی بچوں کو

ساتھ لے چل کھڑا ہوا اور چونکہ بار برداری کا سامان مہیا نہیں تھا، اس لئے سارا ساز و سامان اور کتابیں اور مال وغیرہ نہیں چھوڑا۔"

اگر ہم خیال کریں کہ وہ ۱۴ ستمبر کے بعد پانچ دن یہاں رہے تو گویا اہل و عیال کے ساتھ وہ ۱۹ ستمبر کو یہاں سے روانہ ہوئے اور اگر یہ ۱۹ سے گنا جائے تو یہاں سے روانہ ہونے کی تاریخ ۲۴ ستمبر ہو گی۔ عدالت کے سامنے بیان میں انہوں نے کہا ہے کہ میں دہلی میں صرف پندرہ دن رہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ۴ یا ۹ ستمبر کے قریب یہاں پہنچے ہوں گے، حالانکہ منشی جیون لال کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۶ اگست کو دہلی میں موجود تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس دن وہ بہادر شاہ کے دربار میں شامل ہوئے اور انہوں نے نذر پیش کی۔ عبداللطیف نے تاریخ ۱۹ اگست لکھی ہے، اگرچہ اس کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے یہاں پہنچ چکے تھے۔

میرا خیال یہ ہے کہ عدالت میں جو کچھ انہوں نے کہا، یہ غالباً ٹھیک نہیں۔ اگر انہوں نے الور سے روانگی کی تاریخ صحیح بتائی ہے تو الور اور دہلی کی مسافت اتنی نہیں کہ اس زمانے کے غیر معمولی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی اسے طے کرنے میں تین چار ہفتے لگ گئے ہوں۔ وہ ضرور اس سے بہت پہلے یہاں آ گئے تھے۔

بہر حال وہ وسط اگست ۱۸۵۷ء میں یہاں پہنچے ہوں یا ستمبر کے شروع میں، جیسا کہ مولانا عرشی اپنے مشارٌالیہ مضمون میں ثابت کر چکے ہیں۔ جس فتوے میں ان کی شمولیت پر اصرار کیا جاتا ہے، وہ ان کے آنے سے بہت پہلے جولائی ہی میں شائع ہو چکا تھا۔ اس لئے اس پر ان کے دستخط کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

جب مولانا فضل حق اپنا بیان دے چکے تو ان کی طرف سے مندرجہ ذیل پانچ صفائی کے گواہوں کی فہرست دی گئی۔

۱۔ قادر بخش ۲۔ نبی بخش خیر آبادی ۳۔ علی محمد خاں خیر آبادی ۴۔ موخان خیر آبادی ۵۔ احمد علی خاں، لیکن افسوس کہ ان میں سے بعض اصحاب نے کسی مصلحت سے کچھ ایسی باتیں کہیں، جن سے ملزم کو فائدہ تو درکنار، عین ممکن ہے کہ کچھ نقصان ہی پہنچا ہو۔ سب سے پہلے قادر بخش حاضر عدالت ہوا۔ اس نے کہا:

"مولوی فضل حق خیر آباد کے رہنے والے ہیں۔ میں عدالت فوجداری پٹیالہ کا صدر تھا اور بغاوت شروع ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلا آیا تھا۔ میں سیتاپور میں جلسہ ہونے سے دو ماہ پیشتر وہاں مقیم تھا۔ میری مولوی فضل حق سے کوئی رشتہ داری نہیں۔ یہ جب آخری مرتبہ خیر آباد واپس آئے ہیں تو میں ان سے نہیں ملا تھا بلکہ میری ان سے ملاقات ان کی واپسی کے کوئی سات مہینے بعد ہوئی اور پھر سیتاپور کے جلسے کے بعد دوبارہ ملاقات ہوئی۔ یہ بیگم (حضرت محل) کے آنے تک وہیں مقیم رہے تھے۔ بیگم کے جانے کے بیس دن کے بعد میں سیتاپور سے چلا آیا۔ مولوی فضل حق بھی خیر آباد سے چلے گئے، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئے تھے۔ وہ میرے چلے آنے کے بعد وہاں سے گئے۔ کوئی دو مہینے ہوئے، میں واپس

خیرآباد گیا۔ اس سے پندرہ بیس دن بعد مولوی فضل حق بھی وہاں آئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہے تھے۔"

"مجھے ان کے سابق کے حالات سے زیادہ واقفیت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ سہارن پور میں سررشتہ دار تھے، لیکن کب، اس کا مجھے علم نہیں۔ یہ ٹامس منکاف کمشنر کے پاس بھی بطور سررشتہ دار ملازم رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ فضل رحمٰن مہاراجہ پٹیالہ کے ملازم، ان مولوی فضل حق کے بڑے بھائی ہیں۔"

"میں نہیں جانتا کہ مولوی فضل حق، بیگم (حضرت محل) کے ملازم تھے۔"

"ایک اور فضل حق سہارن پور کا رہنے والا تھا۔ وہ محمدی کا چکلہ دار تھا اور میں نے سنا ہے کہ وہ فیروز شاہ بن بہادر شاہ ظفر کے ساتھ چلا گیا تھا۔"

"میں نے نہیں سنا کہ ان مولوی فضل حق نے کسی شخص کو گمراہ کر کے اسے بغاوت پر آمادہ کیا ہو۔"

صفائی کے دوسرے گواہ نبی بخش خیرآبادی کا بیان حسب ذیل تھا۔

"میں مولوی فضل حق کو بچپن سے جانتا ہوں۔ ان کے والد مولوی فضل امام تھے۔ وہ بھی دہلی میں انگریزی راج میں مفتی تھے۔ مولوی فضل حق بہت برس اپنے والد کے ساتھ دہلی میں رہے اور میں نے سنا ہے کہ وہاں سررشتہ دار تھے اور سہارن پور میں بھی انگریزی ملازمت میں تھے۔ بغاوت سے پہلے یہ راجہ الور کے ملازم تھے۔ کوئی پندرہ مہینے ہوئے، جب یہ اپنے وطن خیرآباد آئے۔ یہ دو مہینے کے لگ بھگ یہاں رہے اور پھر میرے خیال میں لکھنؤ چلے گئے۔ جب انگریزوں نے لکھنؤ فتح کیا تو یہ واپس خیرآباد آئے اور دو تین مہینے یہاں رہے۔ میں نے پھر سنا کہ یہ ہر گاؤں گئے ہیں جو خیرآباد میں دس کوس شمال میں ہے۔ اس کے بعد میں نے انہیں آج سے ڈیڑھ مہینہ پہلے خیرآباد میں پھر دیکھا۔"

"میں نے نہیں سنا کہ یہ بریلی کے نواب (خان بہادر خان) یا بیگم (حضرت محل) کے ملازم رہے ہیں۔"

"ان کے دو بھائی زندہ ہیں۔ فضل رحمٰن اور مظفر حسین۔ فضل رحمٰن راجہ پٹیالہ کے ہاں ملازم ہے۔ مظفر حسین اجمیر میں فقیر (مجاور) ہے۔"

"میں نے نہیں سنا کہ مولوی فضل حق نے کسی کو گمراہ کر کے اسے باغی بنایا ہو یا خود انہوں نے خان بہادر کی ملازمت اختیار کر لی ہو۔"

"ہاں میں نے سنا ہے کہ ایک روز فضل حق شاہ جہان پور کا رہنے والا تھا۔ وہ خان بہادر خاں کا ملازم تھا اور فیروز شاہ کے ساتھ بھی گیا تھا۔"

تیسرے صفائی کے گواہ علی محمد خاں خیرآبادی تھے۔ انہوں نے یہ بیان دیا:

''ڈھائی برس ہوئے، جب مولوی فضل حق الور سے خیرآباد آئے۔ سیتاپور میں بغاوت کو دو برس ہوئے ہیں۔ مولوی فضل حق خیرآباد میں بغاوت کے بعد آئے تھے۔ اگرچہ میں ان دنوں رام پور میں تھا، لیکن ان کے یہاں آنے کے پندرہ روز بعد میں بھی خیرآباد پہنچا۔ جب یہ رام پور سے گزرے تھے تو میں نے انہیں وہاں دیکھا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ چونکہ الور میں میری ملازمت جاتی رہی ہے، اس لئے میں واپس وطن جارہا ہوں۔ میں یہاں دو مہینے گھر پر رہا۔ اس زمانے میں یہ خیرآباد ہی میں تھے۔ اس کے بعد کا مجھے علم نہیں کیونکہ میں ڈریہ میں ملازم ہوگیا تھا۔ چھ مہینے بعد اہل وعیال کو لے جانے کے لئے میں ڈریہ سے خیرآباد آیا تو ان ہی ایام میں مولوی فضل حق بھاگ کر ہرگاؤں چلے گئے۔ اس وقت کے بعد میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

چوتھے گواہ ممو خان خیرآبادی نے صرف اتنا کہا کہ:

''کوئی سال بھر ہوا، مولوی فضل حق پٹیالے سے خیرآباد آئے، جہاں وہ راجہ کے ملازم تھے۔ سیتاپور میں بغاوت ان کے آنے کے بعد ہوئی۔ ایک سال پہلے جب بیگم (حضرت محل) یہاں سے گئی ہے تو مولوی فضل حق بھی خیرآباد سے بھاگ گئے۔''

آخری گواہ احمد علی تھے۔ انہوں نے بس اتنا کہا کہ:

''میں نے سات مہینے ہوئے، مولوی فضل حق کو بونڈی میں دیکھا تھا۔ میں وہاں پانچ دن رہا۔ اس سے زیادہ کا مجھے علم نہیں۔''

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ان صفائی کے گواہوں کے بیان بھی آپس میں متفق نہیں مثلاً نبی بخش خاں کہتے ہیں کہ مولانا فضل حق کو خیرآباد آئے پندرہ مہینے ہوئے ہیں۔ علی محمد خان یہ واقعہ ڈھائی برس پہلے کا بتاتے ہیں اور ممو خان کوئی سال بھر کا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں عدالت ان میں سے کسی پر بھی اعتماد نہیں کرسکتی۔

متذکرہ بالا پانچ گواہوں میں پہلے دو یعنی قادر بخش کے بیان بہت حد تک ان کے حق میں تھے۔ خاص طور پر نبی بخش نے جملہ واقعات کسی اینچ پینچ کے بغیر پوری صراحت اور جرأت سے بیان کئے ہیں۔ علی محمد کے بیان میں اگرچہ کوئی خاص مولانا موصوف کے خلاف تھی لیکن اس کے ہاں ایک اہم مسئلہ سے متعلق تضاد ہے۔ اس نے کہا کہ انہیں خیرآباد واپس آئے ڈھائی برس ہوئے ہیں اور یہ خیرآباد اور سیتاپور میں بغاوت شروع ہونے کے بعد یہاں آئے تھے۔ اتنی بات تو ان کے حق میں تھی کیونکہ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ان کا شورش میں کوئی ہاتھ نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پیدا ہوچکی تھی لیکن اگلے سوال کے جواب میں اس نے کہہ دیا کہ وہاں بغاوت ہوئے دو برس ہوئے ہیں۔ گویا یہ ان کے وہاں پہنچنے کے بعد ہوئی۔ یہی بات اس گواہ کے بعد ممو خان خیرآبادی نے بھی کہی۔ اس نے تصدیق کی کہ:

"سیتاپور میں بغاوت ان کے آنے کے بعد ہوئی۔"

آخری دونوں بیان سب سے کمزور بلکہ بے کار ہیں اور چونکہ یہ صفائی کے گواہوں کے ہیں، جن کی فہرست ملزم کی پیش کردہ تھی، اس لئے ظاہر ہے کہ عدالت پر اس کا اثر مخالفانہ ہی ہوسکتا ہے۔

کپتان تھربرن نے استغاثہ اور ملزم اور صفائی کے گواہوں کے بیانات لینے کے بعد ۲۸ فروری ۱۸۵۹ء کو مندرجہ ذیل فرد جرم مرتب کی اور مقدمہ جوڈیشل کمشنر اودھ کی عدال میں منتقل کردیا۔

فرد جرم

۱۔ ملزم (مولوی) فضل حق نے مئی ۱۸۵۸ء میں بونڈی کے مقام پر باغی سرغنہ مموخاں کے مشوروں میں نمایاں حصہ لیا۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود باغیوں کا سردار تھا اور لوگوں کو بغاوت پر اکساتا رہا۔

۲۔ مئی ۱۸۵۸ء میں بونڈی کے مقام پر وہ لوگوں کو قتل پر اکساتا رہا۔ مثلاً اس نے باغی سرغنہ مموخاں کو ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کے قتل کا مشورہ دیا۔

تشریح

فروری ۱۸۵۸ء میں باغیوں نے ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو گرفتار کرلیا اور اُسے بیگم اور مموخاں کے پاس لے گئے جو ان دنوں قلعہ بونڈی کے اندر اور اس کے گردونواح میں پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ عبدالحکیم کے ساتھ ہی ایک اور شخص مرتضیٰ حسین بھی گرفتار ہوا تھا، جو اگرچہ سرکاری ملازم تو نہیں تھا لیکن چونکہ وہ انگریزوں کا خیر خواہ تھا، اس لئے باغیوں کی آنکھ میں کھٹکتا تھا۔ جب یہ دونوں شخص مموخاں کے سامنے پیش ہوئے تو ملزم نے جو وہاں موجود تھا، قرآن کی آیتیں پڑھیں اور یہ رائے ظاہر کی کہ یہ دونوں موت کے سزاوار ہیں۔ شہادت سے ثابت ہے کہ فضل حق ملزم کا مموخاں پر بہت اثر تھا۔ یہ اس کے مشیر تھے اور اس حیثیت سے باغی فوج میں گویا سرغنہ تھے۔ انہوں نے مموخان پر اپنے اثر ورسوخ کو عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین کے خلاف استعمال کیا۔

اگرچہ ان دونوں نے بعد میں قید سے رہائی حاصل کرلی، لیکن یہ فضل حق کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ہوئی یعنی باغی سرغنہ (مموخاں) نے انہیں مولوی احمد شاہ کی جائداد ضبط کرنے کو بھیج دیا تھا۔

اس پر مقدمہ کے جملہ کوائف، گواہوں کے بیانات اور کپتان تھربرن کی تحریر کردہ فرد جرم جوڈیشل کمشنر (اودھ) مسٹر جارج کیمبل اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت میں پیش ہوئی۔ انہوں نے ۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو یہ فیصلہ صادر کیا۔

مولوی فضل حق پر الزام یہ تھا:

الزام

بغاوت اور قتل پر انگیخت۔

تشریح (۱)

وہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے دوران میں بغاوت کا سرغنہ رہا اور دہلی، اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی۔

تشریح (۲)

اُس نے بوندی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سرغنہ ممو خاں کی مجلس مشاورت میں سرگرمی دکھائی۔

تشریح (۳)

اس نے بوندی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو قتل کرنے کی ترغیب دی۔ ملزم نے جرم سے انکار کیا اور سماعت شروع ہوئی۔

عدالت کے سامنے ملزم مندرجہ ذیل امور میں مجرم ثابت ہوا۔

۱۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں اس نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔

۲۔ ۱۸۵۸ء میں بوندی کے مقام پر اس نے باغیوں کے، جو وہاں پڑاؤ ڈالے جمع تھے اور بالخصوص باغی سرغنہ ممو خاں کے مشوروں میں خاص سرگرمی دکھائی۔ ان ہی ایام میں اس نے ایسے فتوے دیے جن کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔

"۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو اسے بطور شاہی قیدی حین حیات حبس بعبور دریائے شور اور اس کی تمام جائداد کی ضبطی کی سزا دی گئی۔"

نقل فیصلہ

ملزم کے مقدمے کے دو پہلو ہیں۔ یہ تو معلوم ہی تھا کہ وہ ۱۸۵۸ء میں اودھ کے باغی سرغنوں کا مشیر خاص تھا لیکن اس کی گرفتاری کے بعد دہلی سے اس کے پرانے تعلقات کے باعث وہاں کے حکام سے بھی اس سے متعلق استصواب کیا گیا تو کمشنر دہلی نے اس کے جو حالات تحریر کئے، ان سے معلوم ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی میں بھی اس کی سرگرمیاں بعینہٖ اسی قسم کی تھیں لیکن جہاں تک قیام دہلی کے زمانے میں اس کے چال چلن کا تعلق ہے، وہاں کے گواہ عدالت کے سامنے نہیں، نہ ملزم کو ان گواہوں پر جرح کرنے اور عائد کردہ الزامات کی جواب دہی کا موقع ہی دیا گیا ہے، البتہ جہاں تک اودھ کا تعلق ہے اگر یہ مقدمہ ثابت ہو جائے، تو پھر ملزم کے عام چال چلن اور رویے کے لئے دہلی کی شہادت بھی تائیدی اور توثیقی حیثیت سے تسلیم کی جاسکتی ہے۔

اس پر الزام یہ لگائے گئے:

اول: پوری بغاوت کے دوران میں بالعموم لوگوں کو بھڑکانا اور اس امر کی قوی شہادت موجود ہے کہ ایک

موقعہ پر اس نے قتل کی شہ دی، جو براہ راست قتل کے مترادف تھی لیکن چونکہ جن اشخاص کے قتل کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ واقعی قتل نہیں کیئے گئے تھے، اس لئے عدالت نے ملزم کے خلاف یہ جرم تسلیم نہیں کیا، بلکہ اس بات کا بھی یقین نہیں کہ انجام کار ملزم نے ان اشخاص کی رہائی کے لئے بھی اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کر دیا ہو۔

بہرحال عدالت کی نظر میں یہ ثابت ہے کہ اس موقعہ پر ملزم نے بلاضرورت مستعدی دکھاتے ہوئے صراحت سے ایسا فتویٰ دیا، جس کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔ اس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور ان کے من مانے معنی کیے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر اور مرتد ہیں اور اس لئے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے بلکہ اس نے باغی سردار سے یہاں تک کہا کہ اگر تم انہیں قتل نہیں کرتے تو تم خود خدا کی نظر میں مجرم ہو۔ ہم نے اس شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا ہے کہ ممکن ہے اس نے اس خاص موقعہ پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا، ان سے اس کا مقصد یہ ہو کہ یہ اشخاص انگریزی ملازمت ترک کر کے باغیوں کے ساتھ مل جائیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ایسے معتقدات (فتووں) کا اصلی مقصد قتل کی ترغیب دینا ہے، جس کی متعدد مثالیں اس بغاوت کے دوران ملتی ہیں۔

''دہلی میں بھی اس کا یہی کام تھا اور اودھ میں بھی۔ اس نے اپنی یہ سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اس نے مقدمے کے دوران میں ایک موقعہ پر یہ صفائی پیش کی تھی کہ اودھ میں دو مشہور فضل حق ہیں لیکن یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ وہ دوسرا شخص سابق میں ضلع بریلی کا تحصیلدار تھا اور پچھلے ایام میں چکلہ دار اور باغیوں کا سرغنہ رہا ہے لیکن ملزم تو کبھی صاحب سیف رہا ہی نہیں بلکہ اُس کی ہمیشہ صاحب رائے ومشورہ کی حیثیت سے شہرت رہی ہے اور وہ بونڈی کے مقام پر باغیوں کی مجلس شوریٰ (پریوی کونسل) کا اہم رکن تھا۔ یہ بات مشکوک ہے کہ آیا ملزم کسی باقاعدہ عہدے پر فائز تھا یا اس مجلس شوریٰ کی کوئی رسمی حیثیت بھی تھی یا نہیں، لیکن اس سے متعلق تو کوئی شبہ نہیں اور یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیران خاص ہیں۔ باغی فوج میں ان کی (اربعہ شوریٰ) کے نام سے شہرت تھی بلکہ کبھی کبھی انہیں ''کچہری پارلیمنٹ'' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس شوریٰ میں ملزم بہت ممتاز تھا۔

''یہ بات بھی قطعی شہادتوں سے ثابت ہوگئی ہے کہ ملزم سردار ممو خاں کا خاص معتمد علیہ تھا اور وہ اکثر ان سے مشورہ کرتا رہتا تھا۔ جیسا کہ اس موقع پر بھی ہوا، جب اس نے قتل کا فتویٰ دیا۔''

''یہ تو ظاہر ہے کہ ملزم بہت قابل آدمی ہے لیکن جس طرح اوپر بیان ہوا، اس نے بے ایمانہ ہوس یا مذہبی تعصب کے باعث باغیوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور ان کا مشیر بن گیا۔ وہ خطرناک ترین آدمی ہے، جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس لئے انصاف اور امن عامہ کا یہ تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے۔''

''وہ اودھ کا باشندہ ہے اور ایک ایسے خاندان کا فرد ہے، جو انگریزی حکومت کا ساختہ پرداختہ ہے، بلکہ ایک زمانے میں وہ خود بھی سرکاری ملازمت میں اچھے بڑے عہدے پر متمکن تھا لیکن گزشتہ کئی برس سے وہ انگریزی ملازمت ترک کر کے اودھ، رام پور، الور وغیرہ متعدد دیسی ریاستوں میں معقول عہدوں پر ممتاز رہا ہے۔ اس کی ہمیشہ

بہت شہرت رہی ہے۔ جن گواہوں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ بھی مولوی فضل حق کا نام اکثر سنتے آئے تھے۔ بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے وہ دیدہ دانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے۔''

''ملزم کے بڑھاپے اور سماج میں اس کی نمایاں حیثیت اور اودھ کا باشندہ ہونے اور اس کے سرکار انگریزی کا نہیں، بلکہ گزشتہ کئی برس سے دیسی ریاستوں کا ملازم ہونے کا مدنظر رکھتے ہوئے ہم مناسب خیال کرتے ہیں کہ اس سے عام قیدی کی جگہ سیاسی قیدی کا سا سلوک کیا جائے۔''

چونکہ فوجی عدالت کے فیصلوں سے متعلق یہ قاعدہ ہے کہ ان کے خلاف مرافعہ (اپیل) نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ بالعموم تصدیق کے لئے حکام بالا کے پاس بھیج دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ جوڈیشل کمشنر کی عدالت سے مولانا فضل حق کے مقدمے میں جو فیصلہ ہوا تھا، اُسے بھی تصدیق کے لئے گورنر جنرل باجلاس کونسل کی خدمت میں کلکتے بھیج دیا گیا۔ جب مولانا کو معلوم ہوا کہ ابھی امید ہے کہ شاید اس میں تبدیلی کرائی جا سکے تو انہوں نے اپنے وکلاء مسرز سون ہو، بینی اینڈ لیز لی کی وساطت سے گورنر جنرل کی خدمت میں یہ التماس کی کہ میرے ساتھ انصاف نہیں ہوا اور جوڈیشل کمشنر کا فیصلہ رد کر دیا جائے۔ جب اس پر جواب ملا کہ کمشنر کے فیصلے کی تصدیق کر دی گئی ہے تو انہوں نے پھر حسب ذیل درخواست پیش کی۔

درخواست بحضور جناب ارل کیننگ جی۔ سی۔ بی وائسرائے و گورنر جنرل باجلاس کونسل

''میرے خلاف جو مقدمہ چلایا گیا اور اس میں جو فیصلہ ہوا ہے اور جو سزا مجھے دی گئی ہے، یہ حضور ملکہ معظمہ کے عام معافی کے اعلان کے خلاف ہے۔

۱۔ مجھ پر ''بغاوت اور قتل کی ترغیب'' کا الزام لگایا گیا ہے لیکن شاہی اعلان نے یہ تمام جرم معاف کر دیئے ہیں، اس لئے بفرض محال یہ خیال کر لیا جائے کہ یہ فدوی ان جرائم کا مرتکب ہوا تھا، جب بھی اس اعلان شاہی کی موجودگی میں مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے اور جو سزا دی گئی ہے یہ خلاف قانون ہے۔ اعلان نے عام معافی سے صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا ہے، جنہوں نے براہ راست برطانوی رعایا کے قتل میں حصہ لیا۔ قاتلوں کو پناہ دی یا وہ لوگ جو بغاوت کے سرغنہ تھے یا جنہوں نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔ میں ان میں سے کسی جرم کا بھی بلاواسطہ یا بالواسطہ مرتکب نہیں ہوا۔

۲۔ میرے خلاف پہلا الزام یہ ہے کہ میں باغیوں کا سرغنہ تھا اور میں نے انہیں بغاوت کی ترغیب دی لیکن سپیشل کمشنر نے جو فیصلہ صادر کیا ہے، اسی سے اس الزام کی تغلیط ہو سکتی ہے۔ اس میں انہوں نے متضاد باتیں بیان کی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ملزم (یعنی میں) باغیوں کا مشیر کار اور بغاوت کا سرگرم ترغیب دینے والا تھا۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ جب بغاوت شروع ہوئی تو ملزم الور میں ملازم تھا لیکن بعد کو وہ خود بخود دہلی آیا اور اس کے بعد

وہ باغیوں کے قدم بقدم چلتا رہا۔
مشیر کو بغاوت کی ترغیب دینے والا کہنا، لفظوں کو غلط معنی پہنانا ہے اور جو شخص محض باغیوں کے قدم بقدم چلتا رہا ہے، اسے ترغیب دینے والا کہنا، علت، معلول کو بالعکس کر دینے کے مترادف ہے۔

۳۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سپیشل کمشنر نے بیان کیا، میں ریاست الور میں ملازم تھا اور دہلی میں بغاوت شروع ہونے کے چار مہینے بعد اپنی بیوی کو وہاں سے نکالنے کے لیے آیا۔ میں بیوی کو ساتھ لے کر اپنے وطن خیرآباد چلا گیا اور مئی ۱۸۵۸ء میں احمد اللہ کے ظلم و ستم سے جان بچانے کی خاطر بھاگ کر بونڈی گیا۔ اس کے بعد مسیح الزمان نے مجھے پکڑ کر قید کر دیا کیونکہ میں نے اس کے ساتھ بغاوت میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا اور اب حالت یہ ہے کہ مسیح الزمان جو باغیوں کا سرغنہ تھا، وہ تو آزاد دندناتا پھر رہا ہے اور میں جس کا جرم صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ میں نے باغیوں کو مشورہ دیا، باوجودیکہ خود بعض باغیوں نے اس شخص سے رابطہ رکھا جسے حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا دی گئی ہے۔

۴۔ سزا کے خلاف قانون ہونے کا ثبوت خود اسی فیصلے میں موجود ہے، جو سپیشل کمشنر نے میرے مقدمہ میں دیا ہے۔ لکھا ہے۔ یہ بہت ہی خطرناک آدمی ہے اور کسی وقت بھی انتہائی نقصان پہنچا سکتا ہے، اس لئے انصاف اور امن عامہ کا تقاضا یہ ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے۔

اس سے ظاہر ہے کہ فدوی کو سزا اس لئے نہیں دی گئی کہ میں نے کوئی جرم کیا ہے، بلکہ مجھے ملک بدر اس لئے کرنا چاہیے تاکہ میں کبھی نقصان پہنچانے کے قابل نہ رہوں۔ اگرچہ یہ سمجھنا محال ہے کہ میرے جیسا پیرانہ سال شخص نقصان ہی کون سا پہنچا سکتا ہے۔ سپیشل کمشنر اس لئے مقرر ہوئے تھے کہ وہ ان لوگوں کے مقدمات کی سماعت کریں، جن کے جرائم ملکہ معظمہ کے اعلان معافی سے مستثنیٰ کیے گئے تھے۔ فدوی کسی ایسے جرم کا مرتکب نہیں ہوا۔ اگرچہ سپیشل کمشنروں نے مجھے سزا اس جرم کی دی ہے کہ میں نے لوگوں کو بغاوت کی ترغیب دی تھی لیکن خود ان کی اپنی رائے یہ بھی ہے کہ میں باغیوں کے قدم بقدم چلتا رہا یا زیادہ سے زیادہ میرا جرم صرف اتنا ہے کہ میں نے بعض سرغنوں کو مشورہ اور صلاح دی، جو اعلانِ شاہی کے مطابق بہت خفیف جرم ہے لیکن میں نے ان کے فیصلے سے جو فقرے نقل کیے ہیں، ان سے ان کا اصلی مدعا واضح ہو جاتا ہے یعنی وہ مجھے ملک سے باہر اس لئے بھیجنا چاہتے ہیں کہ میرا چال چلن ٹھیک رکھنے کی یہی ایک ضمانت ہے۔

۵۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ مقدمہ، اس کی کارروائی اور اس میں جو سزا دی گئی ہے، یہ سب کچھ ملکہ معظمہ کے اعلان کے خلاف بلکہ قانون اور انصاف ہی کے خلاف تھا تو کیا حضورِ والا اس کی حمایت کریں گے؟ اور یہ کس لئے؟ تاکہ ایک مُسن شخص اپنے خاندان سے دور مرنے کو بھیج دیا جائے اور اس کے خاندان کو اس آذوقہ سے محروم کر دیا جائے جو ان کی زیست کا سہارا ہے۔

میں نے بیسن اینڈ لنرلی کی وساطت سے درخواست پیش کی، تو مجھے مطلع کیا گیا کہ میرے مقدمے پر

باجلاس کونسل غور کرنے کے بعد سپیشل کمشنروں کے فیصلے کی تصدیق کردی گئی ہے۔ اگرچہ جو سرکاری جواب مجھے ملا ہے، اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا، تاہم مجھے یقین ہے کہ سپیشل کمشنروں کے فیصلے کا بہت غور اور توجہ سے مطالعہ کیا گیا ہو گا۔ بہرحال اس سے ایک بات تو واضح ہے کہ جب ان کے فیصلے کی تصدیق میری درخواست موصول ہونے سے پہلے ہی کردی گئی تھی تو اس میں جو دلائل میں نے پیش کئے تھے، ظاہر ہے کہ ان پر غور نہیں کیا گیا۔

''اس لئے اب میری عاجزانہ درخواست ہے کہ جو کچھ صدر میں سپیشل کمشنروں کے فیصلے کے خلاف قانون ہونے سے متعلق لکھا گیا ہے، اس پر غور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ شاہی اعلان کے مطابق انصاف کیا جائے یا ایک پیرانہ سال بوڑھے اور اس کے متعدد بے بس افراد خاندان پر رحم کو مدنظر رکھا جائے۔ بہرحال میری رہائی اور مختصر جائداد کی بحالی کے احکام صادر فرمائے جائیں گے۔''

اس دوسری درخواست سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا اور سزا بحال رہی، البتہ گورنر جنرل نے معلوم ہوتا ہے یہ حکم دیا کہ نہ ان سے مشقت لی جائے، نہ ان کے بڑھاپے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان سے کسی طرح کی سختی کا سلوک کیا جائے۔ اس پر جوڈیشل کمشنر نے مئی ۱۸۵۹ء میں ڈپٹی کمشنر لکھنو کو اطلاع دی کہ اب اس سزا کا حکم نافذ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں انہیں کالے پانی (جزیرہ انڈیمان) بھیجنے کے لئے لکھنؤ سے کلکتے منتقل کیا گیا۔ ان ایام کی کہانی خود مولانا کی زبان سنیے۔

اپنے عربی نثری رسالے ''الثورۃ الہندیہ'' میں لکھتے ہیں:

''جب نصاریٰ نے مجھے دھوکے اور فریب سے قید کر کے ابتلاء میں مبتلا کیا تو پہلے ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے کو اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین کو منتقل کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے الم پر الم اور غم پر غم پہنچائے۔ میرے جوتے اور لباس اتروا لیا اور ان کی جگہ موٹے جھوٹے اور کھردرے کپڑے پہنا دیئے۔ مجھ سے نرم اور آرام دہ بستر لے لیا اور اس کی جگہ تکلیف دہ اور سخت بستر دے دیا، جو گویا کانٹوں کا بچھونا یا انگاروں کا بستر تھا۔ انہوں نے میرے پاس لوٹا یا پیالا یا کوئی اور برتن نہیں چھوڑا۔ وہ مجھے کھانے کو اُڑد کی دال اور پینے کو گرم پانی دیتے تھے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں براہ راست کلکتہ نہیں لے گئے تھے بلکہ مختلف جیلوں میں رکھتے ہوئے آخر کار کلکتہ پہنچایا تھا۔

غالب کے مولانا فضل حق سے ہمیشہ بہت دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات رہے تھے۔ ان کے فارسی نظم و نثر کے مجموعوں میں اس کے متعدد ثبوت موجود ہیں۔ جس زمانے میں مولانا زیرحراست کلکتہ پہنچے ہیں، مرزا کے ایک اور مصیبت زدہ عزیز دوست ناظر حسین، مرزا اور اس کے بھانجے یوسف مرزا بھی کلکتے میں موجود تھے۔ یوسف مرزا نے غالب کو ان کے حال سے اطلاع دی ہوگی۔ اس پر مرزا غالب نے یوسف مرزا کو لکھا۔

''مولانا (فضل حق) کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا، کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم

دوامِ حبس بحال رہا بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے جو ہونا تھا۔ سو ہولیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

مرزا کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً مولانا فضلِ حق کے فرزندِ اکبر مولانا عبدالحق نے گورنر جنرل باجلاس کونسل کے فیصلے کے خلاف وزیر ہند کی خدمت میں مرافعہ پیش کیا تھا یا کرنے والے تھے لیکن بہرحال ظاہر ہے کہ اس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

جب تک انڈیمان کے لئے جہاز کا انتظام نہیں ہوسکا، مولانا کو یہاں کلکتے میں علی پور جیل میں رکھا گیا تھا۔ جب شہر کے معززین کو اس کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے طور پر مندرجہ ذیل درخواست تیار کر کے حکومت کی خدمت میں راونہ کی۔

بحضور رائٹ آنریبل گورنر جنرل ہند باجلاس کونسل۔

کلکتہ اور اس کے مضافات اور اضلاع کے دستخط کنندگان کی درخواست۔

"ہم درخواست کنندگان نہایت ادب سے یہ کہنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ مولانا فضل حق (الور کے رہنے والے) جنہیں سپیشل کمشنر اودھ نے سزا دی ہے اور جو حبس دوام بعبور شور کے قیدی کی حیثیت سے علی پور قید خانے میں لائے گئے ہیں، محض بے گناہ آدمی ہیں اور ہم ان کے صحیح حالات بیان کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔"

"حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کی سخت سزا انہیں دی گئی ہے، وہ کسی طرح اس کے مستحق نہیں کیونکہ وہ تو قاتل ہیں نہ باغی۔ نہ انہوں نے لوگوں کو بغاوت پر بھڑکایا، نہ انہیں اپنے ہاں پناہ دی، نہ ان کی ملازمت میں رہے۔ اودھ کے حکام نے بھی ان میں سے کوئی الزام ان پر نہیں لگایا، نہ کوئی ایسی بات ہی وہ ان کے خلاف ثابت کر سکے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ یہ بھی ثابت نہیں کر سکے یہ وہی فضل حق ہیں، جو اس سے پہلے تحصیلدار رہا تھا اور بغاوت کے آغاز کے زمانے میں چکلہ دار تھا۔ اس کے بالعکس یہ پوری طرح ثابت ہوگیا ہے کہ ان مولانا فضل حق کا بلاواسطہ یا بالواسطہ بغاوت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ الور میں تھے اور شورش کے شروع ہونے کے چار مہینے بعد اپنے اہل و عیال کو دہلی سے ساتھ لے کر اپنے وطن خیر آباد چلے گئے اور جب تک انگریزی تسلط اُودھ پر دوبارہ قائم نہیں ہو گیا اور باغی وہاں سے فرار نہیں ہو گئے، یہ وہیں مقیم رہے اور جب خیر آباد کے متعدد باشندے اپنے جان و ناموس کو بچانے کی خاطر وہاں سے بھاگے، تو مولانا فضل حق نے بھی ان کا تتبع کیا۔ جب شاہی اعلان کے ذریعے عام معافی کا اعلان ہوا اور لوگ مقررہ معیار کے اندر حاضر ہونے لگے تو وہ بھی فوجی افسر اعلیٰ کے سامنے پیش ہوئے اور اس کی اجازت سے اپنے مکان پر رہنے لگے۔ اس کے بعد انہیں یہاں سے گرفتار کیا گیا اور اگرچہ ان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوسکا۔ اس کے باوجود محض شہادت کی بنا پر انہیں ایسی سخت سزا دی گئی ہے۔"

"اس سزا کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ حکام کی نظروں میں وہ بہت ذہین اور قابل شخص ہیں۔ ہم

حضور والا کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ بہت کبیرالسن ہیں۔ ستر برس کے لگ بھگ اور اگرچہ وہ بے شک بہت قابل شخص ہیں، لیکن ان کی ساری قابلیت صرف ایک بات یعنی علوم شرقیہ کی تعلیم میں محدود ہے۔ اس کے علاوہ اگر وہ واقعی عقلمند یا قابل ہیں، تو یہ عقل سے قطعی بعید ہے کہ کوئی شخص حکام وقت کے خلاف کھڑا ہو جائے، جن کی طاقت اور تسلط یقینی اور مسلمہ ہے۔ وہ نہ بوڑھے اور کمزور ہیں، بلکہ وہ اکثر مختلف بیماریوں کا شکار رہتے ہیں اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی مرض اُن کے لاحق رہا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ کسی خطرناک اقدام کے لیے انہیں فرصت ہی کب ملی ہوگی۔"

"ہم درخواست کنندگان کی نہ قیدی سے کوئی رشتہ داری ہے نہ تعلق، گو ہم میں سے بعض یا ان کے شاگرد ہیں یا ان کے شاگردوں کے شاگرد، لیکن چونکہ بے شبہہ وہ قابلِ احترام اور بے گناہ شخص ہیں اور ان کا ان الزامات سے کوئی واسطہ نہیں جو اُن کے خلاف عائد کیے گئے ہیں۔ اس لیے آپ کی خدمت میں یہ التماس کرتے ہیں کہ یا تو انہیں رہا کر دیا جائے جس کے وہ ہر طرح مستحق ہیں یا انہیں بنگال کے کسی ضلع ہی میں قید کر دیا جائے یا پھر مکہ کو ہجرت اور حج کی اجازت مرحمت ہو۔"

(دستخط) مولوی فضل رحمٰن قاضی القضاۃ کلکتہ

حاجی محمد صدیق از عمایدِ کلکتہ، عبدالوحید تاجر

(اسی طرح ڈیڑھ سو اصحاب کے دستخط ہیں)

لیکن افسوس کہ یہ سعی بھی رایگاں گئی اور حکومت نے اپنا فیصلہ بدلنے سے انکار کر دیا۔

آخر کار انہیں کلکتے سے فاری کوئین (Fir Queen) نامی جہاز پر سوار کر کے سمندر پار انڈیمان بھیج دیا گیا، جہاں اُس زمانے میں تمام عمر قیدی بھیجے جانے کا فیصلہ ہوا تھا۔ ان کا جہاز ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ بلیر پہنچا۔ یہاں ان کا قیدیوں میں دفتری نمبر ۳۶۸۷ تھا۔

انڈیمان کی آب و ہوا اور حالت جیسی کچھ ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اگر آج یہ اتنی خراب ہے تو آج سے سو سال پہلے جو حال ہوگا، اس کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ مولانا فضل حق کو اپنے اہل و عیال سے مفارقت کا خیال ہونا ہی چاہیے تھا۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ وہ بے گناہ سزایاب ہوئے تھے۔ وہ نازونعم میں پلے تھے، ساری عمر اچھے اچھے عہدوں پر باعزت بسر کی تھی۔ اَب یہاں موٹا جھوٹا کھانا اور موٹا جھوٹا پہننا پڑا۔ یہ انقلاب روزگار انہیں کیوں شاق نہ گزرتا!

یہاں پہنچنے کے بعد انہوں نے اپنی سرگزشت عربی نظم و نثر میں قلم بند کرنا شروع کی۔ اُسے انہوں نے فروری ۱۸۶۰ء میں مکمل کیا اور پھر ان تحریروں کو کسی طرح اپنے بڑے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس بھیج دیا۔ ان میں سے ایک قصیدہ ہمزیہ ہے۔ اس میں انہوں نے جزیرہ کی آب و ہوا اور زندگی کی کیفیت اور اپنے حزن و ملال کا تفصیلی حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''مجھ پر ظلم ہوا ہے کہ مجھے اچانک میرے اہل وعیال اور وطن سے دور پھینک دیا گیا ہے۔ حالانکہ میری اولاد ابھی کمزور اور کم سن ہے۔ وہ بھی ظلم سے اپنے گھر سے نکال دیئے گئے ہیں۔ اب ان کے پاس نہ سکونت کی جگہ ہے، نہ سکینت کا ٹھکانہ۔ وہ فقیر و قلاش بن گئے ہیں کیونکہ ان کے پاس نہ مکان ہے نہ روزی، نہ کوئی اور شے۔ میں ان سے جدا ہوا ہوں تو وہ فاقوں کا شکار ہو رہے تھے۔ ان کے پاس نہ کوئی ساز و سامان تھا، نہ مال و دولت۔ عزیز و اقربا نے بیگانوں کی طرح اُن سے پہلو تہی کی اور ان کے برابر کے ملنے والوں نے ان پر ظلم کیا۔ اب قید و بند میرے اور میرے خاندان اور اقارب کے درمیان حائل ہے۔ اب یہاں دوست کی جگہ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ اب نہ میرے احوال کی خبر میری اولاد تک پہنچ سکتی ہے، نہ ان کی خبر مجھے۔ میں اقارب و احباب کی جدائی پر نالاں و گریاں ہوں اور ان کی قسمت میں بھی میری جدائی میں نالہ بکا کے سوائے کچھ نہیں۔ وہ اگر میرے لئے آنسو بہائیں تو جائز ہے کیونکہ موت اور ذلیل قید خانے میں زندگی کے دن گزارنا ایک برابر ہے۔ مجھے اس بیابان جنگل میں لا کے رکھ دیا ہے، جہاں دو وحشیوں، کووں اجنبیوں کے سوائے اور کوئی شے نظر نہیں آتی۔ یہاں کی آب و ہوا ناخوشگوار اور وبائی ہے۔ کھانا ایسا ہے کہ اس سے طبیعت سیر نہیں ہوتی اور پانی ایسا کہ اس سے پیاس نہیں بجھتی۔

پانی ملتا ہے تو گرم، جس سے طبیعت میں طراوت پیدا نہیں ہوتی۔ کھانا ہے تو اڑد کی دال، جس میں ذائقہ نہیں۔

غرض یہاں میٹھا پانی ہے، نہ لذیذ کھانا، نہ کھلی فضا اور میری مصیبت میں میرے جسمانی عوارض میں فتق اور قولنج اور داد نے اور اضافہ کر دیا ہے۔ مجھے یہاں کی آب و ہوا نے تو گویا مجھے ختم ہی کر دیا۔

اسی طرح اپنی گزشتہ خوش بختیوں اور عیش و عشرت کی زندگی یاد کر کے روتے ہیں اور آخر میں دعا کرتے ہیں۔

اے میرے خدا! میری اُمید بر لا اور مجھے دشمنوں کے پنجے سے نجات دلانے میں تاخیر نہ فرما۔

میں سُست کاموں کو آگے بڑھانے میں کوشاں رہا لیکن افسوس کہ جب لڑائی شروع ہوئی تو خود اس میں بڑھ کے حصہ لینے کی جگہ پیچھے بیٹھ رہا۔

میں نے اس موقع پر کمزوری دکھا کے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا۔ خوش قسمت لوگ شہادت کے مرتبے پر فائز ہو گئے لیکن میں اس سے محروم ہوا۔

خدایا! میرے کیے کو معاف کر دے۔ مجھے بخش دے۔ مجھے تجھ سے عفو و درگزر ہی کی توقع ہے۔ بے شک میرے گناہ بہت ہیں، لیکن تیری رحمت بھی تو اتنی وسیع ہے کہ اس کی حد ہے نہ انتہا۔ پس مجھے بخش دے اور معاف فرما اور دشمنوں اور تہمت لگانے والوں نے مجھے جس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے، اس سے نجات دے۔

اور اگر یہ مصیبت، جس کی میں شکایت کر رہا ہوں، تیری طرف سے مقدر ہے۔ جب بھی تو مظلوم کی دعا سے تُو اسے ٹال دے سکتا ہے۔

مظلوم تجھے نہ پکارے تو اور کیا کرے۔ تُو اس کی سُن لے۔ کفار نے اس پر بڑے ظلم و ستم ڈھائے ہیں۔ ان کی مسلسل سختیوں اور تہمتوں اور رسوائیوں نے میری جان عذاب میں کر دی ہے۔''

غرض اسی طرح زار نالیوں سے خداوند تعالیٰ سے رحم کی دعائیں کرتے ہیں کہ کسی طرح اس جلاوطنی سے رہائی اور مخلصی نصیب ہو۔

وہ یہاں کالے پانی پہنچنے کے بعد بھی ہمت نہیں ہارے اور انہوں نے ایک اور کوشش حکام سے دادرسی کی کی۔ ہندوستان میں وہ گورنر جنرل سے اپیل کر کے ناکام ہو ہی چکے تھے۔ اب انہوں نے ۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو مندرجہ ذیل درخواست وزیر ہند کی خدمت میں ولایت بھیجی۔

درخواست بنام وزیر ہند

۱۔ مجھے ملکہ معظمہ کے اعلانِ معافی کے خلاف حبس دوام بعبور دریائے شور اور ضبطی جائداد کی سزا دی گئی ہے۔ میں نے ہندوستان میں تمام حکام مجاز کی خدمت میں انصاف کی یا کم از کم میری عمر کا خیال رکھتے ہوئے رحم کی درخواست کی، لیکن بے سود۔ اب میں اپنے آپ کو دادرسی کے لئے آپ کے قدموں میں ڈالتا ہوں۔

۲۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا اور صرف سپیشل کمشنر کے فیصلے کی اور حکومت ہند سے اپنی درخواست کی نقلیں ملفوف کرتا ہوں۔ انہی سے معلوم ہو جائے گا کہ مجھ پر مقدمہ چلانے، میرا جرم ثابت کرنے اور پھر مجھے سزا دینے میں حضور ملکہ معظمہ کے اعلان کے منشا کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک درخواست کی نقل بھی بھیج رہا ہوں، جو کلکتہ کے مقتدر مسلمانوں نے حکومت ہند کی خدمت میں میری رہائی کے لیے دی تھی۔ میں ذیل میں مختصراً چند باتیں بیان کر دیتا ہوں تا کہ میرے معاملے کی نوعیت واضح ہو جائے۔

۳۔ جیسا کہ سپیشل کمشنر نے بھی اپنے فیصلے میں ذکر کیا ہے، میرا خاندان اپنی دنیوی حیثیت کے لئے بہت حد تک سرکار انگریزی کا مرہونِ منت ہے۔ ایک زمانے میں خود بھی انگریزی ملازمت میں بہت اچھے عہدے پر متمکن تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ میں انگریزی حکومت کے خلاف کسی تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے شورش کا آغاز ہوا ہے، میں ریاست الور میں ملازم تھا۔ میں اس کے چار مہینے بعد دہلی گیا تا کہ وہاں سے اپنی بیوی کو نکال لاؤں جو خطرے میں گھر گئی تھی۔ میں اُسے ساتھ لے کر اپنے وطن خیر آباد چلا گیا اور مئی ۱۸۵۸ء تک وہاں رہا۔ وہاں سے ہمیں ایک شخص احمد اللہ شیخ کے تشددِ مجرمانہ کی بدولت بھاگ کر بونڈی جانا پڑا۔ وہاں ہماری جان خطرے میں تھی۔ بونڈی میں دو شخص...... عبدالحکیم اور مرتضیٰ حسین میرے خلاف ہو گئے۔ یہ دونوں شیعہ تھے۔ مجھے نقصان پہنچانے کی خاطر ان دونوں نے بیان دیا کہ انہوں نے سنا تھا کہ میں ممّوخاں اور دوسرے باغیوں کے مشوروں میں شامل تھا اور قتل کے جواز کے فتوے دیتا تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ جب ہم بھاگ کر بونڈی آ رہے تھے تو ایک باغی سرغنے مسیح الزماں نے ہمیں راستے میں گرفتار کر لیا۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت سختی کا سلوک کیا اور ہمیں کھیڑی میں نظر بند کر دیا۔ خوش قسمتی سے کھیڑی کے باشندے مجھے جانتے تھے۔ ان لوگوں کے کہنے پر مسیح الزماں نے ہمیں رہا کیا۔ اس سے معلوم ہو گا کہ اگر کسی طرح کا میرا باغیوں سے تعلق پیدا ہوا بھی تو میری مرضی کے

(۹ جنوری ۱۸۶۰ء)

مقدمے کے کاغذات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر وزیر ہند نے حکم دیا کہ مولانا کی یہ درخواست تمام متعلقہ کاغذات کے ساتھ ہندوستان کے مقامی حکام کے پاس بھیج کر ان سے دریافت کیا جائے کہ مولانا کو رہا کر دینے کی صورت میں انہیں تو کوئی عذر نہیں ہوگا۔ مختلف دفتری مراحل طے کرتے ہوئے یہ کاغذات جب چیف کمشنر اودھ کے پاس پہنچے تو اس نے ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء کو جواب دیا کہ اگر اس قیدی (مولانا حق) کے ساتھ کسی طرح کی معمولی سی رعایت بھی کی گئی تو اس کی سخت مخالفت کریں گے۔

ظاہر ہے کہ چیف کمشنر کی اس رائے کے بعد ہندوستان یا ولایت کے حکام بالا مولانا کی مندرجہ صدر درخواست پر کس طرح غور کر سکتے تھے۔ یاد رہے کہ چیف کمشنرِ صاحب کے اس آخری جواب کی تاریخ ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء ہے اور اس کے ہفتہ بھر بعد ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو مولانا کا پورٹ بلیر میں انتقال ہو گیا۔ ان للہ وانا الیہ راجعون۔ اب ذرا یہ عبارت پڑھئے۔

"............علامہ موجود نہ تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آ رہے ہیں۔ وہ (سپرنٹنڈنٹ جیل انگریز) یہ ہیئت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ معذرت کے بعد کلرکی میں لے لیا۔ گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔ ادھر علامہ (فضل حق) کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بیخبر پر منشی لیفٹیننٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے۔ پروانہ رہائی حاصل کر کے مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہو گئے۔ وہاں جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا اژدہام تھا۔

عاشق کا جنازہ ہے، ذرا دھوم سے نکلے!

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق کا انتقال ہو گیا۔ اب سپردِ خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت و یاس شریک دفن ہوئے اور بے نیل مرام واپس لوٹے۔

قسمت کی بدنصیبی! کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

افسوس! ہمیشہ کے لئے یہ آفتاب علم و عمل دیارِ غربت میں غروب ہو گیا۔ اب تک مزار مرجع انام و زیارت گاہِ خاص و عام ہے......"

اوپر جو واقعات بیان کر چکا ہوں، انہیں مدنظر رکھیے اور فیصلہ کیجئے کہ یہ ڈرامائی سین کہاں تک قابل اعتبار ہے۔ یاد رہے کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ ان سے مشقت نہیں لی جائے گی اور ان سے کسی طرح کا اہانت آمیز سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ اس صورت میں یہ ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آنے کی بھی خوب رہی۔ پھر یہی نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مولوی شمس الحق صاحب ۲۰ اگست کو یعنی جس دن مولانا کا انتقال ہوا ہے یا بفرض محال اگر تدفین اگلے دن ہوئی ہو، تو ۲۱ اگست کو سہی انڈیمان پہنچے تھے۔ انڈیمان کے سفر میں جو

مشکلات اُس زمانے میں پیش آئی ہوں گی، ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ لکھنؤ سے خشکی کے راستے کلکتے اور کلکتے سے بحری جہاز کے ذریعے انڈیمان...... مہینوں نہ سہی آپ مہینہ بھر سے کم کیا کہیں گے۔ گویا وہ ۲۰ جولائی کے لگ بھگ یہاں سے روانہ ہوئے اور لامحالہ ''پروانہ رہائی'' اس سے پہلے صادر ہو گیا ہو گا۔ جب چیف کمشنر ۱۲ اگست ۱۸۶۱ء کو مولانا کی رہائی کے خلاف اظہار رائے کر رہا ہے تو کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ مولوی شمس الحق صاحب یہ پروانہ لے کر ۲۰ جولائی کو یہاں سے روانہ بھی ہو چکے تھے؟

ایک اور بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر رہائی کا حکم صادر ہو ہی گیا تھا تو مولوی شمس الحق کو اسے دستی لے کر انڈیمان جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور کیا حکومت قیدیوں کی رہائی کے احکام ان کے رشتہ داروں اور متعلقین کے حوالے کر دیا کرتی ہے؟

پھر یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں پورٹ بلیر نہیں بلکہ دہلی یا آگرہ یا لکھنؤ ہے جہاں جنازے کے ساتھ اژدہام ہو سکتا ہے۔ انڈیمان کا جزیرہ عمر قیدیوں کے لیے ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۸۵۸ء ہی میں مقرر ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں یعنی تقریباً ایک صدی بعد بھی یہاں کی ساری آبادی پچیس ہزار سے بھی کم تھی۔ اسی سے صرف اس کے صدر مقام پورٹ بلیر کی آج سے ایک صدی پہلے کی آبادی کا اندازہ کیجیے اور پھر سوچیے کہ اس میں مسلمان کتنے ہوں گے اور پھر لفظ ''اژدہام'' پر غور کیجیے۔ اقتباس کی آخری سطر ہے۔

اب تک مزار مرجع انام اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔''

تعجب ہوتا ہے کہ یہ وہ کیسے لکھ گئے، یہ تاریخ و سیرت کی زبان نہیں۔

غرض اس سارے کی افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں۔

آیئے، اب ان دعاوی پر نظر ڈالیں، جو مولانا فضل حق کے سیرت نگاروں نے ان سے متعلق کیے ہیں اور جنہیں ہم اس مضمون کے آغاز میں نقل کر چکے ہیں اور دیکھیں کہ حق و صداقت کی کسوٹی پر کس حد تک پورے اترتے ہیں۔

ا۔ دعویٰ

''مولانا فضل حق پر مقدمہ سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت کی بنا پر قائم ہوا۔''

آپ نے اوپر مقدمہ کی پوری روداد پڑھ لی اور فرد جرم بھی دیکھ لی۔ اس سے معلوم ہو گا کہ اس دعویٰ کی تینوں شقیں ٹھیک نہیں۔ بنائے مقدمہ ان تینوں میں کوئی نہیں تھی یا کم از کم وہ واقعات نہیں تھے، جن کی طرف اس دعویٰ میں اشارہ کیا جاتا ہے اور یقیناً انہوں نے کوئی ایسا فتویٰ نہیں دیا تھا، جس میں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہو۔

۲۔ دعویٰ

''جس جج کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تھا، وہ ان کا شاگرد تھا اور اسی لئے اُسے ان سے ہمدردی تھی اور وہ دل سے چاہتا تھا کہ یہ بری ہو جائیں۔''

یہ مقدمہ ابتدائی مرحلے پر کپتان تھر برن کے سامنے اور اس کے بعد مسٹر جارج کیمبل سپیشل جوڈیشل کمشنر اور میجر باور قائم مقام کمشنر خیرآباد ڈویژن کی مشترکہ عدالت میں پیش ہوا تھا۔ ان تینوں میں سے کسی کے، کسی زمانے میں بھی مولانا مرحوم کے ساتھ کام کرنے یا ان سے کام سیکھنے کا امکان نہیں۔

۳۔ دعویٰ

''جیوری میں ایک اسیر بھی مولانا کو بری کر دینے کے حق میں تھا۔''

اس مقدمے میں جیوری مقرر ہی نہیں ہوئی تھی۔ دراصل یہ عدالت فوجی (مارشل لاء) قسم کی تھی۔ ایسی عدالتوں میں جیوری نہیں ہوا کرتی، اس لئے اس کے کسی رکن کے ان کی بریت کے حق میں ہونے کا سوال ہی پیدا نہی ہوتا۔

۴۔ دعویٰ

''مولانا فضل حق نے خود استغاثہ کے بیانات اور دلائل ''مثل تار عنکبوت عقلی اور قانونی ادلہ'' سے توڑ دیئے تھے اور امید تھی کہ وہ بری کر دیئے جائیں گے لیکن اس کے باوجود انہوں نے خود اقرار کیا کہ جس فتویٰ کی بنا پر یہ مقدمہ قائم ہوا ہے، وہ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔''

مولانا کا وہ خط بھی آپ نے دیکھا جو انہوں نے نواب رام پور کو لکھا تھا اور ان کا عدالت میں بیان بھی آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ وہ بار بار یہی کہتے ہیں کہ میں نے بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا، مجھے ایک میرے ہم نام میر فضل حق شاہجہان پوری کی جگہ دھوکے میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس بات کا انہوں نے کئی مرتبہ اعادہ کیا ہے۔ استغاثہ کے گواہوں پر جرح کے وقت بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک اور فضل حق سرگرم باغی رہا ہے۔

جہاں تک فتویٰ کا سوال ہے، اصلی فتویٰ مولانا عرشی نے ''اخبار الظفر'' دہلی سے لے کر اپنے مضمون میں نقل کر دیا ہے۔ اس کے آخر میں جن علماء کے دستخط ہیں، ان میں مولانا فضل حق کا نام ہی سرے سے نہیں۔ درحقیقت عدالت جس فتویٰ کی طرف اشارہ کر رہی ہے، وہ محض یہ ہے کہ ان کے قول کے مطابق جب عبدالحکیم کو مموخاں اور مولانا کے سامنے پیش کیا گیا ہے تو مولانا نے قرآن کی آیت پڑھی، جس کا مفہوم یہ تھا کہ جو شخص نصاریٰ کا دوست ہے وہ گویا انہی میں سے ہے۔ پس اس کا قتل جائز ہے اگرچہ خود مولانا سرے سے اس واقعے ہی سے انکاری ہیں، لیکن اگر بفرض محال یہ درست ہے، جب بھی تو یہ وہ فتویٰ جہاد نہیں، جو ۱۸۵۷ء کی شورش کے زمانے میں دیا گیا تھا اور جس کی طرف مولانا کے سیرت نگاروں نے اشارہ کیا ہے۔ پس یہ متہورانہ بیان، جو ان سے منسوب کیا جاتا ہے کہ ''فتویٰ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔'' کس طرح درست اور حسب حقیقت ہو سکتا ہے؟

۵۔ دعویٰ

''اس اقرار اقبال کے بعد عدالت نے ''بے حد رنج کے ساتھ'' حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا۔''
عدالت کے رنج کا سوال ہی کہاں پیدا ہوا۔ استغاثہ نے جو الزام ان پر عائد کئے تھے، عدالت کے نزدیک وہ ثابت ہو گئے تھے۔ پس انہوں نے انہیں مجرم گردانا اور انہیں سزا دے دی بلکہ جوڈیشل کمشنر تو یہ لکھتا ہے کہ انہیں سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور خاص طور پر انہیں جلاوطن کر دینا چاہیے۔ کیا اظہار رنج اسی طرح کیا جاتا ہے؟

۶۔ دعویٰ

''یہ فیصلہ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سنا۔''
اگر انہوں نے یہ فیصلہ ''مسرت اور خندہ پیشانی'' سے سُنا تھا تو اس کی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے۔ کہ (۱) جو الزام ان پر لگائے گئے تھے، ان کے نزدیک وہ صحیح تھے اور (۲) وہ جانتے تھے کہ ان کا نتیجہ یہی سزا ہونا چاہیے تھی، جو مجھے دی گئی ہے اور (۳) میں نے پہلے کار ثواب کیا تھا، اب اس سزا کے بعد درجہ شہادت حاصل کر رہا ہوں۔ کیا ان میں سے کوئی صغریٰ و کبریٰ بھی درست ہے؟

وہ بار بار حکومت سے درخواست کرتے ہیں، خود بھی لکھتے ہیں اور دوسروں سے بھی یہی لکھواتے ہیں کہ میں بے گناہ اور مظلوم ہوں۔ دشمنوں اور چغل خوروں نے مجھے اس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے بلکہ اپنی پیرانہ سالی اور مصیبتوں کے ساتھ اپنی اولاد کی صغرسنی اور عسیر الحالی کا دردناک قصہ بیان کر کے حکومت سے رحم کی التجا کرتے ہیں کہ مجھے رہا کر دیا جائے۔ خدا سے بھی گڑگڑا گڑگڑا کے دعائیں کرتے ہیں کہ بار آلہا! مجھے اس ابتلا سے نجات دلوا۔
اگر انہوں نے فیصلہ ''مسرت اور خندہ پیشانی'' سے سنا ہوتا تو کیا ان کا یہی رویہ ہوتا؟
غرض پورے حالات کا بہ نظر نمایہ مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں واقعی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ انہوں نے اس سے پہلے لوگوں کو جو تلقین بھی کی ہو (اور اس کی طرف انہوں نے ایک جگہ اشارہ بھی کیا ہے) لیکن جب ہنگامہ شروع ہوا تو وہ عملاً اس سے الگ تھلگ رہے۔ نہ علمی پہلو سے اس میں شریک ہوئے نہ عملی لحاظ سے۔ انہوں نے نہ کوئی فتویٰ لکھا نہ تلوار ہی اٹھائی۔
آج تک ان کی نسبت جو غلط باتیں مشہور رہی ہیں، دراصل یہ نتیجہ تھیں۔ ہماری اس خواہش کا کہ ہم انہیں نہ صرف بزم علم و عقل اور مجلس قال اقول ہی میں صدر نشین، بلکہ اس ''جنگ آزادی'' میں بھی برابر کا شریک دیکھنا چاہتے تھے۔ پھر اتفاق سے بعض غیر محتاط بلکہ غلط روایات نے ہماری اس خواہش کی تکمیل کے لیے سامان بھی مہیا کر دیا اور ہم نے بے جھجک انہیں تسلیم کر لیا اور اس پر کوئی ہمیں ملامت نہیں کر سکتا کیونکہ پورے واقعات تک ہماری رسائی ہی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب یہ کہ حقیقت واشگاف ہو کر ہمارے سامنے جلوہ فروز ہو گئی ہے، ہمیں اپنی گزشتہ

غلطیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے۔ اتنی لمبی مدت کے معتقدات کو ترک کرنا آسان نہیں اور خوش اعتقادی ہمیں اس سے بغاوت پر ابھارے گی، لیکن مرحوم کی صحیح عزت اسی میں ہے کہ ہم انہیں ان کے صحیح مقام پر بٹھائیں نہ کہ غلط باتیں ان سے منسوب کر کے ان کا ایک فرضی بت بنائے رکھیں، جو ممکن ہے، خوبصورت تو ہو، لیکن اصل سے اس کا کوئی دُور کا بھی تعلق نہیں ہوگا، لیکن سوچیے تو کہ آخر ہمیں اس پر کسی طرح کا رنج و افسوس کیوں ہو، ان کی علمی اور ادبی اور دماغی صلاحیتوں کے باعث ان کا جو مقام ہماری نظروں میں ہے، وہ تو بہر حال اپنی جگہ پر قائم ہے۔ انہوں نے علم و فضل کی جو شمع روشن کی تھی، وہ بحمدہ اب بھی پوری تابناکی سے روشن نظر آتی ہے۔

(در: تحقیقی مضامین از مالک رام، دہلی ۱۹۸۴ء، ص ۹۰-۱۳۲)

☆......☆......☆